ہفت روزہ حیدرآباد
راہی
۹-۱۶ جون
۱۹۷۸
ہفت روزہ
الفتح
کراچی
پابندی ختم ہونے کے بعد شائع ہوگا
معراج کی زندگی خطرے میں ہے
بھٹو کو پریشان کرنے والے خود پریشان ہو جاتے ہیں

احتساب

اسلامی نظام اور قومی حکومت

اخبار کارکن جائز جد وجہد کر رہے ہیں گرفتار ہوتے، سزا کاٹی اور کوڑے بھی کھائے مگر کچھ لیڈر صاحبان خاموش تماشائی بنے رہے ملک میں بے روزگاری، بدامنی، انتہا کو پہنچ چکی ہے اندر ہی اندر ایک لاوا ایک رہا ہے خدا خیر کرے آگے کیا ہوگا۔ شاہ ایران کا انٹرویو چھپا ہے جس میں انہوں نے پاکستان کی سلامتی کی طرف اشارہ کیا ہے دوسری طرف ایران میں ہنگامے اور افغان انقلاب یہ تاثر دے رہا ہے کہ اقتدار کے مالک عوام ہیں۔ مگر ہمارے حکمران پچاس سال پیچھے کی سوچ میں ہیں۔ جبر نا ممکن نظر آ رہا ہے آزادی صحافت کا گلا دبایا جا رہا ہے صحافت ملک کی ایک بہترین چیز ہے لوگوں تک ملک کی صحیح صورتحال پیش کرنے کا فرض صحافی انجام دیتے ہیں مگر صحافت کو کچلنے کے لیے زیر شاہی دس قدم آگے بڑھ گئی ہے ایسی مثال کہیں دنیا میں نہیں ملے گی کہ کسی صحافی کو کوڑے لگائے گئے ہوں۔ دوسری طرف ملک کی سب سے بڑی اور اہم پارٹی پیپلز پارٹی کے سب چوٹی کے لیڈر جیلوں میں بند ہیں۔ احتساب صرف پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے لیئے ہے قومی اتحاد کے لیڈر حکومت کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں بلے چارے غریب جیل کے ڈر سے جی حضوری میں عافیت سمجھتے ہیں، ویسے مارشل لا ر انتظامیہ کو بھی معلوم ہے پاکستان میں اصل قیادت کس کے پاس ہے سب کو موقعہ فراہم کیا جا چکا ہے مگر عوام میں مقبولیت کوئی حاصل نہیں کر سکا ہے آج کل پیپلز پارٹی کے نکالتے ہوئے اکیلے مولانا کو موقعہ دیا جا رہا ہے مگر ایسے لوگوں کا جو حشر ہوگا وہ سب کو معلوم ہے فوجی حکومت پورے سال کا بجٹ پیش کرے گی۔ اس کا مطلب انتخاب کا کچھ پتہ نہیں ہے دوسری طرف ر... ... سیوں پر ابھی تک پابندی ہے لوگ بہت مایوس ہو چکے ہیں، فوجی حکومت مخلوط حکومت اسلامی نظام، احتساب وغیرہ کے چکروں میں گذارہ ہو رہا ہے۔ قومی اتحاد والوں کو الیکشن میں جیتنے کی کوئی امید نہیں ہے اس لیئے وہ انتخابات کا مطالبہ نہیں کر سکتے اور چور دروازے سے حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

میر موت علی تالپور۔ ٹنڈو پرس۔

جماعت کا پروپیگنڈہ

جماعت اسلامی کی ترقی پسندوں سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ اس ملک میں ترقی پسندوں کے خلاف مہم چلا کر ظلم کے خلاف انصاف کی راہ روکے رکھے۔ خیر جماعت اسلامی کو کروڑوں روپے کی امداد صرف اسی لیئے ملتی ہے لہٰذا یہ تو مجبور ہیں اپنے آقاؤں کا حکم ماننے پر مگر ہم ترقی پسند لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ ان کے غلط پروپیگنڈہ کا جواب دیں اور سادہ لوح اور معصوم عوام کو گمراہ ہونے سے بچائیں۔ تمام لوگوں کی نظر سے زندگی اور جسارت کے وہ پرچے نظر سے گزرے ہونگے جن میں سندھ کے ترقی پسند ادیبوں، لیڈروں، شاعروں صحافیوں اور اساتذہ کو بے جا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان مضامین میں ان لوگوں میں خاص ہدف عظیم انقلابی رہنما جام ساقی تھے جام ساقی کے نام سے کون واقف نہیں۔ ون یونٹ کی تحریک سے لیکر آج تک جام ساقی جس طرح ظالم حکمران طبقوں سے برسرپیکار ہے اس سے پاکستان اور خاص طور سے سندھ کے لوگ بخوبی واقف ہیں جماعت السلامی کے ارباب عبدالمالک فرماتے ہیں کہ جام ساقی کئی بار ہندوستان جا چکے ہیں اس بات کی تردید خود جام ساقی نے ہفت روزہ معیار میں کر دی ہے کہ وہ یہ ثابت ہونے پر پھانسی چڑھنے پر تیار ہیں دوسری بات یہ کہ جام ساقی کمیونزم کا پرچار کرتے ہیں یہ بحث تو بہت طویل ہے مگر مختصراً ہم جماعت اسلامی والوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جام ساقی مظلوم عوام کا نمائندہ ہے جام ساقی سندھ کے عوام کی آنکھ کا نور ہے جام ساقی سے سندھ کے ہاریوں، مزدوروں اور طالب علموں کو بے حد پیار ہے اس لیئے کہ یہ وہ آدمی ہے جس نے حکمرانوں کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا اور آج بھی جب کہ بڑے بڑے جمہوریت پسند اور قوم پرست بک چکے ہیں عوام دشمنوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنا کھڑا ہے۔ ہم جماعت اسلامی والوں کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ جام ساقی، نظیر عباسی، حمیدہ گھانگرو اور دیگر ادیب و شعراء سندھ کے قومی رہنما ہیں ہم ان کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کریں گے۔

قاسم بروہی۔ جامشورو

بھٹو اور تاریخ

آخر کار مولانا کوثر نیازی اپنی اصلیت دکھا رہی ہے۔ پارٹی کے کارکن اور عوام تو اس خوشامدی مولانا کی فطرت سے ان دنوں ہی واقف ہو چکے تھے جب مولانا بھٹو کی خوشامد اور چمچہ گیری کے ذریعہ اپنی وزارتی کرسی کو مضبوط کیا کرتے تھے۔ عوام مولانا کو خوشامد کا بادشاہ سمجھتے تھے ان دنوں جب بھٹو صاحب اقتدار کا محور تھے تو مولانا جلسوں میں بھٹو صاحب کی مدح میں "بھٹو کو پھول اور خود کو پتی، بھٹو سورج خود کرنیں، بھٹو چاند خود ستارے" کہا کرتے تھے۔ جس پر حقیقت پسند عوام نے جو ہمیشہ خوشامد سے نفرت کرتے ہیں بھٹو کو دیگ اور مولانا کو چمچہ کہنے کا فی البدیہہ لطیفہ ایجاد کر لیا تھا۔ خدا معافی دے، خوشامدی مولانا بعض اوقات جوشِ خوشامد میں اکثر کہہ جایا کرتے تھے کہ "جب خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک ہے تو قائد عوام بھی ایک ہے" مولانا صاحب بھٹو صاحب کی ہوا کچھ اس طرح باندھا کرتے تھے کہ بھٹو صاحب نے اپنے دور اقتدار میں ہمیشہ مولانا کو بہت ہی قریب رکھا۔ نتیجتاً بھٹو صاحب اپنے ان صاف گو ساتھیوں کو جو صحیح بات کہنے کی جسارت کرتے تھے بے ادب اور دشمن سمجھنے لگے تھے۔ یہ تو کل کی بات تھی لیکن آج جب بھٹو صاحب جیل میں ہیں اور ہائیکورٹ سے موت کی سزا پا چکے ہیں خوشامدی مولانا قائد کی محسن کے خلاف سرگرم ہو چکے ہیں اور پارٹی کے بانی رہنما ڈاکٹر کو خوشامدی سازشی عناصر نے بھٹو صاحب کے ہاتھوں جیل میں بند کرا دیا تھا۔ آج بھٹو صاحب بھی اپنے سابق ساتھیوں معراج محمد خان۔ جے اے رحیم مختار رانا، رسول بخش تالپور، مولی سعید، نواز بابر، تاج محمد لنگاہ، ضیاء الدین بٹ خالق خان بہت یاد کر رہے ہوں گے۔ جنہیں بھٹو صاحب نے کوثر نیازی جیسے خوشامدیوں کے کہنے پر جیل بھجوایا تھا۔ کاش بھٹو صاحب خوشامدیوں سے بچے رہتے کارکن تو آج بھی مولانا کی علیحدگی سے خوش ہیں وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بھٹو تاریخ کے نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ تاریخ کا سفر جاری ہے کل نہیں رہا تو آج کمہ بھی ختم ہوتا ہے آنے والے کل کے لیے پاکستان کے محنت کش عوام منتظر ہیں

اکرام الحق۔ فیصل آباد۔

قاتل اور قتل گاہیں

جن نامساعد اور کٹھن حالات میں آپ لوگوں نے حق وصداقت کا علم بلند رکھا ہے اس سے ہمارے سر فخر سے بلند ہو گئے ہیں۔ اس جرات رندانہ پر آپ کو خراج تحسین پیش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ میں یہ الفاظ بطور خوشامد نہیں کہہ رہا بلکہ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ میری خواہشات اور آرزوؤں کے آئینہ دار ہیں آپ میرے یہ جذبات ہفت روزہ الفتح میں کام کرنے والے تمام دوستوں اور قارئین تک پہنچا دیں۔ اس دور میں جب کہ انسان بکتے ہیں ضمیر بکتے ہیں، قلم بکتے ہیں آپ لوگوں نے حقیقت میں سچائی کی لاج رکھ لی ہے ملک بھر میں رجعت پسندوں کے اخبارات رسائل و جرائد مخالفین کی پگڑی اچھالتے، ننگی گالیاں دینے اور ملک میں غلاظت پھیلانے کیلئے مادر پدر آزاد ہیں مگر صحیح حقائق لکھنے والے اخبارات و رسائل یا تو بند کر دیئے جاتے ہیں یا ان کو لاکھوں روپے کے ضمانت طلبی کے نوٹس جاری کر دیئے جاتے ہیں گویا یہ پابندیاں یکطرفہ ہیں۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

سامراجی دلالوں، رجعت پسندوں کو کھلی چھٹی ہے ملک میں سیاسی پابندیوں کے باوجود یہ لوگ اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ دورے کر رہے ہیں پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف نہ تو کوئی ضابطہ لاگو ہوتا ہے اور نہ یہ کسی نظم وضبط کے پابند ہیں۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو فوراً ضابطے حرکت میں آ جاتے ہیں اور ہم قید اور کوڑوں کے سزاوار قرار دیئے جاتے ہیں۔

عبوری حکومت کی غیر جانبداری کا بھرم کھل گیا ہے ظلم وجبر کا خنجر صرف ہمارے سروں پر لٹک رہا ہے۔ سامراجی غلیظ طبقاتی استحصال اور قومی جبر میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے پاکستان کی پیداواری قوت مزدور کسان محنت کش بری طرح پس رہے ہیں ان کا خون پسینہ، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، کی کاروں میں پیٹرول بن کر جل رہا ہے حد تو یہ ہے کہ اس دھرتی کے مظلوم محنت کشوں کے حقوق کی بات کرنے والوں کو الٹا لٹکا دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اور اس پروگرام پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے ملتان کے مزدوروں، پٹ فیڈر کے کسانوں، خضدار کے طالب علموں کے واقعات اس سلسلے کی کڑیاں ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس آواز کو کوڑوں لاٹھیوں، گولیوں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ سفر جاری رہے گا۔ ہماری منزل ایک ہے صرف طریقہ کار میں فرق ہے آپ قلم کے ذریعے اس دھرتی کے مظلوم لوگوں کی خدمت کرتے ہیں اور ہم تنظیمی طور پر یہ فرض ادا کرتے ہیں۔

کوئی پل کی بات ہے یہ کوئی دم کی رات ہے یہ
نہ رہے گا کوئی قاتل، نہ رہیں گی قتل گاہیں

مہر عطاء محمد سیال ئئ
سیکرٹری جنرل لیبر ایکشن کمیٹی تحصیل سکھر۔

ہفت روزہ

راھی

حیدرآباد

جلد: ۸ شمارہ: ۲

۹-۱۶ جون
۱۹۷۸ء

قیمت تین روپے

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
واحد بشیر

کالم نگار
حسین نقی، شبیہ الحسن

کچھ سچ کچھ جھوٹ
امر جلیل

طنز و مزاح
ابو ضیا اقبال

انتظامی امور
حاجی عدیل

سرورق
سعید الدین حسین

خاص مضامین

اسلام آباد
ذوالفقار حیدری

ضلعی نمائندے

میرپور خاص
محبوب احمد

فیصل آباد، گوجرانوالہ
طارق سعید
محمد افضل جنجوعہ

سانگھڑ
ایاز سندھی

شیخوپورہ
ٹوبہ ٹیک سنگھ
غیاث الدین جانباز

نوابشاہ، سکھر
جیکب آباد، لاڑکانہ
محمد نواز خلجی

گوادر
سلیمان شیرف

ٹنڈو الٰہ یار
کامل سمعون

میانوالی
روشن ملک

ملتان
ناصر زیدی

آزاد کشمیر
سید نذیر گیلانی

صوبائی نمائندے

سندھ مقیم حیدرآباد
احسان عظیم

پنجاب مقیم لاہور
کاشف

سرحد مقیم پشاور
شہزاد غزنوی

بلوچستان مقیم کوئٹہ
ناصر عرفات

غیر ممالک

پیکنگ
رشید بٹ

ماسکو
محمد زاھد

کینیڈا
سعید ابن سعود

لندن
عبدالحفیظ قریشی

یورپ، فاروق طارق

متحدہ عرب امارات
مقیم دوبئی
غلام جیلانی

چیف ایڈیٹر
مولانا ابوالفتح غلام رسول چشتی
پبلشر احمد راھی نے
یاسیات پریس سے
چھپوا کر دفتر ہفت روزہ
راھی نائن کاپر حیدرآباد سے شائع کیا

دفتر رابطہ
الفتح مطبوعات
۹/۱-۵ ڈی ای ترمسری کمرشل
پی ای سی ایس کراچی ۲۹
فون ۴۳۲۲۷۴۰

بحران کا واحد حل

پاکستان میں یکم مارچ ۱۹۸۰ء سے رسمی طور پر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد ہے۔ ویسے بھی ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد مکمل سیاسی سرگرمیاں بحال ہی نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن پچھلے دنوں غیر رسمی سیاسی اجتماعات پریس کانفرنسوں اور بیانات کا سلسلہ جاری ہے یہ اور بات ہے کہ ان سرگرمیوں کی اجازت صرف مخصوص جماعتوں اور افراد کو حاصل ہے۔ پیپلز پارٹی تو خیر مطعون ہی ٹھہری اس کے علاوہ بھی حکومت کی پالیسیوں اور روش سے اختلافات رکھنے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ اس کی مثال قومی محاذ آزادی کے کنوینر معراج محمد خان کا معاملہ ہے جنہیں انتہائی عجلت کے ساتھ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر ایک سال کی سزا دی جا چکی ہے۔

یہ تو موجودہ صورت حال کا ایک معروضی پہلو تھا۔ دوسری طرف جو بیانات سامنے آ رہے ہیں ان میں تحریک استقلال کے رہنما اصغر خاں صاحب، جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر مولانا نورانی میاں کے بیانات اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام خط خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تاخیر سے ہی سہی ان بزرگوں نے موجودہ سیاسی بحران کے واحد ممکنہ حل کو نہ صرف محسوس کر لیا ہے بلکہ اپنے اپنے مخصوص انداز میں جلد از جلد انتخابات کروا کر حکومت منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے قارئین اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم نے جلد از جلد عام انتخابات کو ہی موجودہ بحران کا واحد حل سمجھا ہے۔ اور اس کے حق میں مسلسل قلمی جہاد کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی، بیرونی ممالک میں پاکستان کے وقار میں کمی اور داخلی صورت حال کے بگڑنے، مہنگائی اور بدعنوانیوں میں اضافے کا سوال ہے اور جن کی طرف مولانا نورانی نے اپنے خط میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس بارے میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ موجودہ صورت حال کے لازمی نتائج ہیں اس لیے کہ ملکی سیاسی اور اقتصادی مسائل سے نمٹنا نہ تو فوجیوں کے فرائض میں شامل ہے نہ اس کے لیے انہیں کوئی خصوصی تربیت دی گئی ہے۔ نہ ہی ان کے اور عوام کے درمیان زندہ اور پُرجوش رابطہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقتی طور پر خلا کو پُر کرنے کا کام دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مدت وقتی سے بڑھ کر طویل ہو جائے تو پیچیدگیاں بڑھتی ہی جائیں گی۔ اور اس سلسلے میں کسی کو قصور وار ٹھہرانے سے بہتر یہی ہے کہ انہیں جلد از جلد ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے پر آمادہ کیا جائے۔

جہاں تک سیاسی جماعتوں کو معطل کرنے یا ان پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہے تو ایسی تجویز کو چاہے وہ کسی حلقے کی طرف سے پیش ہو نا عاقبت اندیشانہ ہی قرار دے سکتے ہیں۔ ہاں اس کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ پاکستان کو موروثی ملوکیت کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر یہ صورت نہ تو عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہے نہ ہی برصغیر کے مسلمانوں نے بادشاہوں کی غلامی قبول کرنے کے لیے انگریز غیر ملکی سامراجیوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑی تھی۔ اگر یہ بات صرف لوگوں کے احساسات معلوم کرنے کی غرض سے کہی گئی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کے کثیر التعداد عوام کے احساسات کی ترجمانی کر دی ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اب شمر بچ کے نہیں جاتا
نہیں جا سکتا!

حسین نقی

بیوی کہتی ہے ہانڈی میں دخل نہ دو۔

ایڈیٹر کہتے ہیں اخبار نویسی نہ کرو اخبار نویس بنو!!

باوردی اور بے وردی افسرانِ بالا' بالخصوص وزارت اطلاعات کے پہلے عملاً اور اب بلحاظ عہدہ سیکرٹری جنرل مجیب الرحمان صاحب کا حکم ہے سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔

تبلیئے میں کیا کروں۔

مرحوم حمید احمد خان سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کہا تھا: "یہ تم نے کیا پیشہ اختیار کیا ہے۔ غیر شریفانہ۔ ایم اے پاس کر کے پنجاب واپس آجاتے یہاں یونیورسٹی میں پڑھاتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نے سیاسیات کا سال اول یعنی آدھا ایم اے۔ اول درجہ سے بھی زیادہ اور امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ چند روز بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کو میں ایک انتہائی خطرناک آدمی لگا اور انہوں نے مجھے یونیورسٹی سے تین سال کے لیئے نکال دیا میرا خیال ہے، اچھا ہی ہوا۔ ورنہ صحافت نہ سہی پنجاب یونیورسٹی سہی۔ یہاں سے بھی نکالے جاتے یا پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس الحاج حبیب الرحمان صاحب کسی جلوس جلسے کی ذمہ داری لگا کر رپٹ لکھواتے اور چالان بسلسلہ مشکوک چال چلن کرا دیا جاتا۔ کہ موصوف کا خیال ہے جس تعلیمی ادارے میں گڑبڑ ہو اس کا ذمہ دار سربراہ ادارہ ہوگا ہم پولیس کے متعلق کیا کہیں کہ پنجاب میں رہتے ہیں اور پنجاب پولیس ملک کی آن بان شان میں اضافہ کرتی رہتی ہے کہ مسعود محمود اور سعید احمد خان بھی اسی محکمے سے متعلق رہے ہیں اور کیا کچھ نہ کر گزرتے ہر گزرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ابھی کل میرے ایک کاروباری دوست راستے میں مل گئے گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل جو آجکل شبنم ڈکیتی کیس کے سبب کافی مشہور ہو رہا ہے اور پہلے الطاف گوہر صاحب جو اس زمانے میں جب ہم نے اخبار نویسی شروع کی سیکرٹری اطلاعات تھے اور ماشاءاللہ اس ملک کے بیشتر اعلیٰ افسروں کی طرح خود بھی گورنمنٹ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ تھے، لہٰذا گورنمنٹ کالج لاہور سے ہماری کافی اچھی واقفیت ہے اور اب ہمارے حلقہ احباب میں اس ادارے کے فارغ التحصیل ماشاءاللہ کافی یار دوست ہیں۔

ان دوست نے جن کا نام . . . . . ہے اور جنہوں نے غالباً ایم اے سیاسیات میں کیا ہے مجھے یہ بتایا کہ پچھلے مہینے رات ۲ بجے کے قریب ریلوے پولیس ان کے گھر میں گھس آئی۔ بیوی کو ننگے پاؤں پولیس کی گاڑی تک لے گئی دو گھنٹے بٹھائے رکھا۔ اس دوران ان کی چھ ماہ کی بچی بلکتی رہی۔ میں نے کہا صاحب آپ کا نام تو میں نے شبنم ڈکیتی کیس میں نہیں پڑھا۔ ویسے بھی آپ گورنمنٹ کالج میں اب نہیں پڑھتے یہ آپ کے گھر پولیس کیسے گھس آئی۔ انہوں نے بتایا کہ شبنم ڈکیتی کیس کے کسی بھی ملزم کے گھر پولیس اس طرح نہیں گئی نہ ان کے گھر والوں کی کوئی بے عزتی کی گئی، وہ اعلیٰ گھرانوں، خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں ان کے یعنی میرے دوست . . . کے گھر پولیس اس لیئے آئی۔ اور چادر چار دیواری کو روندتی ہوئی آئی کہ وہ گڑھی شاہو میں ایک معمولی گھر میں رہتے ہیں اور ریلوے پولیس کا یہ خیال تھا کہ ان کے گھر ان کے علاقے کے ایک نوجوان وکیل جو سرخ پرچم مزدور محاذ کے کسی جلسے میں جا کر تقریر کرتے تھے کی "تلاش میں چھاپے مار رہی تھی۔

مسٹر . . . نے مزید بتایا کہ سرخ پرچم مزدور محاذ کے رہنما جعفر خان پر ریلوے پولیس کے . . . کے حکم پر تشدد کیا گیا۔ اس تشدد کے نسخے میں زمین پر الٹا لٹانا اور چھتر مارنا شامل تھا اس سے پہلے جعفر خان کے برادر نسبتی کو جو جعفر خان کے گھر میں رہتا ہے اس "جرم" میں سزا دی گئی کہ اس کو یہ کیوں نہیں معلوم تھا کہ جعفر خان کہاں ہے۔

. . . صاحب کے مطابق اسی قسم کا رویہ سرخ پرچم کے ایک اور رہنما حنیف کھوکھر کے بھائی سے بھی روا رکھا گیا وہ بھائی کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔

میں نے . . . صاحب سے کہا کہ آپ ٹریڈ یونین کی آڑ لے رہے ہیں یہ ہمارے سرکاری اہلکاروں کے مطابق شر پسند عناصر کا شیوہ ہے۔ یہی کام ہمارے منہاج برنا' نثار عثمانی صاحبان بھی کرتے ہیں آپ نے ضرور ریل کی پٹری اتاری ہوگی۔ . . . صاحب نے کہا کہ انکا نام اس کیس میں کہیں نہیں۔ اور وہ تو حق ابدال گئے بھی نہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ ضرور آپ کی غیر قانونی لوہے کا سریا تیار کرنے کی بھٹی لگی ہوگی اور آپ ریلوے کا لوہا چوری کر کے اس سے سریا تیار کرتے ہوں گے اسی لیئے آپ لوگوں کو ریلوے کے فعال . . . نے پکڑا ہوگا۔

یہ سنکر . . . صاحب جو اب تک کافی سنجیدگی سے میری تفتیش کے جوابات دے رہے تھے غیر سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کاش ایسا ہوتا، کاروبار بھی چل رہا ہوتا اور

ریلوے پولیس کے . . . موصوف سے یاری بھی ہوتی. پانچوں گھی میں - !

چلتے پھرتے لوگ راستہ روک لیتے ہیں اور جب سے یہ مساوات کا پھڈا شروع ہوا ہے لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات اس بارے میں کرتے ہیں بالخصوص میرے سیاستدان دوست جن میں پاکستان کی حامی جان مسلم لیگ، تمام جغرافیائی سرحدیں ڈھا کر پاکستان کی نظریاتی سرحدیں محفوظ کرنے والی جماعت اسلامی، بھٹو مارکہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں سب سے پہلے اپنے لیڈر ایئر مارشل اصغر خان کو آگے کرنے والی تحریک استقلال، بیگم ولی خان، والی این ڈی پی حتیٰ کہ نوابزادہ نصراللہ خان کی پی ڈی پی اور نوابزادہ علامہ احسان الٰہی ظہیر، مجیب الرحمان شامی اور فاروق قریشی کی تناسی کباب اور آم پارٹی سے بھی میرے انتہائی دوستانہ مراسم ہیں بلکہ جماعت اسلامی کے دوستوں سے تو کچھ اس قسم کے کہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

تو جناب ان پارٹیوں کے لوگ بھی اب صحافیوں سے رقابت محسوس کرنے لگے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہماری ملک گیر جماعتوں کے لیڈروں کے اتنے لمبے لمبے بیان ریڈیو ٹی وی سے نشر نہیں ہوتے جتنے تحصیل بلکہ گاؤں تک کی سطح کے صحافیوں کے.

میں ان دوستوں کو کہتا ہوں۔ آپ کو حسد نہیں کرنا چاہیئے آپ بھی پی یو جے، اینیک کی چار افراد پر مشتمل مذاکراتی ٹیم کی حمایت میں بطور صحافی بیان دیجئے۔ انشاءاللہ العزیز ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلیویژن پر ہی نہیں قومی سطح پر بڑے مانے جانے والے جسارت اور ٹرسٹ کے اخباروں اور اکثر نوائے وقت اور حریت میں بھی صفحہ اول پر آپ کے بیان کے لیئے تنگہ کی ریزرویشن کرادی جائے گی بغیر رشوت اور شرطیہ آزما کر دیکھیئے۔

میں ان دوستوں کو سمجھاتا ہوں کہ آپ کے قومی سطح کے ایڈیٹر اگر ریڈیو ٹی وی پر کم جگہ پاتے ہیں تو دیکھیئے ہمارا تو قومی سطح کے لیڈروں منہاج برنا، نثار عثمانی اور حفیظ راقب کا تو نام بھی وہاں سننے میں نہیں آتا۔ پھر ہم ان دوستوں سے کہتے ہیں عملی کام کیجئے۔ ایسا کام جیسا ہمارے چار مذاکراتی دوستوں نے کیا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی کہا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

ہمارے مذاکراتی دوست عمل کرتے ہیں لہٰذا ان کی زندگی بن رہی ہے سنور رہی ہے۔

اور ایک ہیں نثار عثمانی کہ ہماری لیڈری کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہیں تو پھر زندگی جنت کیسے بنے جہنم ہی بنے گی۔ اسی لیئے اس کڑکڑاتی گرمی میں ملتان جیل میں قید بامشقت کاٹ رہے ہیں تادم تحریر کہ مذاکرتی معاہدے کی سیاہی خشک ہو کر پتھر بن چکی ہے لیکن ان کی رہائی کا پروانہ جاری نہیں ہوا۔ ہو بھی جائے تو موصوف کو اتنی گرمی آگئی ہے کہ کہتے ہیں کہ صحافیوں کے جائز مطالبات پورے ہونے تک تحریک جاری رہے گی.

ہم، مشکل یہ ہے کہ عثمانی صاحب کے چائے پان اور سگریٹوں کے اس قدر زیر بار ہیں کہ ان کے کان میں بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ چھوڑیئے اس دعوے کو۔ تمام سمجھدار بڑے سینئر صحافیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے علامہ اقبال ٹاؤن میں مکان بنایئے اپنی بیمار اور تنہا بیگم کا علاج کرایئے بچے کو لوئر ٹوپا پھر کیڈٹ کالج حسن ابدال میں داخلہ دلایئے، دو کاروں کے پرمٹ لیکر بیچیئے۔ ایک اپنی بنایئے۔ کچھ ہماری 'صحیح نظریہ پاکستان' قومی سالمیت اور اتحاد کے مطابق رہنمائی کیجئے۔ (میاں وہاب صدیقی۔ یہ پرچہ کسی صورت میں نثار عثمانی کے ہاتھ نہ لگے) میں نے لاہور میں رہنا ہے تاوقتیکہ کے بعد بھی آپ تاوقتیکہ کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ وہ وقت نہ لائے کہ ہم ریڈیو سے منیر نیازی کا وہ دعائیہ ترانہ سنیں جب جنرل راؤ فرمان علی کی اسلامی مشرقی پاکستانی ریاست کا دارالخلافہ دشمن کے قبضہ میں جا رہا تھا۔ اور منیر نیازی دعا کر رہا تھا ؎

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو پائندہ رہو!!!

ہاں وہ چلتے چلتے راستہ روک لینے والوں کی بات ہو رہی تھی اس میں ایک کیریکٹر رہ گیا ہے وہ بھی آپ سنتے جائیں پھر کالم دو چار گھنٹے پہلے روانہ کروں گا کہ پچھلا پی آئی اے کی اعلیٰ کارکردگی اور باکمال پرواز کی نظر ہو کر دیر سے پہنچا۔ جس پر میرا گرو واحد بشیر کافی ناراض لگ رہا تھا فون پر، اور اس نے اسی لیئے ابھی تک میرے کالموں کے پیسے نہیں بھجوائے ہیں اور ادھر میری چپل ٹوٹ چکی ہے۔ نوکری خطرے میں ہے اور بال کٹوانے کی فرصت ہے نہ جیب میں پیسے۔

جی ہاں! مجھے عباس اطہر میرے دفتر کی سیڑھیوں کے نیچے ملے تھے۔ میرے دفتر میں سیڑھیاں اب زیادہ ہو گئی ہیں۔ ان سے چڑھی نہیں جاتیں پہلے بھی وہ کافی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر تھک چکے ہیں۔ دن چڑھنے کے ساتھ ان کا دریا بھی چڑھ جاتا ہے پھر انہوں نے مساوات کی کافی سیڑھیاں روز چڑھیں پھر پریس کلب کی، پھر بھٹو پریس سنیٹر کی پھر تحریک استقلال کے "آزاد" کی۔ آج کل کبھی کبھار شاید مجیب شامی کے "بادبان" کی سیڑھیاں چڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یا پھر ہوٹل کارواں کی۔

عباس اطہر اور مجھ میں ایک قدر مشترک ہے بیروزگاری کاٹنے کی۔ راستہ البتہ ذرا اوکھرا اوکھرا ہوتا ہے یعنی ان کی نوکری سیڑھیاں چڑھ کر اور میری سیڑھیوں سے اتر کر جاتی ہے

آپ سوچتے ہوں گے۔ انٹ شنٹ ہانک رہا ہے یہ نہیں بتاتا کہ عباس اطہر نے کیا بتایا کیا کہا۔ تو سنیئے عباس اطہر نے میرے یار نے کہا ہے۔

شمر آگیا ہے۔

کشتے کے پشتے لگ جائیں گے۔

تم حسینؑ کیوں بننا چاہتے ہو۔

دراصل عباس اطہر آزاد شاعری کی ایک نئی نسل کا شاعر ہے۔ مجھے شاعری نہیں آتی. نثر بھی آپ نے پڑھ لی ہو گی اناپ شناپ لکھتا ہوں۔ پہلے بھٹو صاحب بھی پوچھتے تھے "آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے." اب بھی بعض لوگ ایسے ہی سوچتے ہیں۔ پھر بھی میں عباس اطہر سے کہا وہ چودہ سو برس پہلے کی بات تھی۔ اب حسینؑ کے ساتھ صرف ۷۲، نہیں ۷۲ ہزار، ۷۲ لاکھ، بلکہ ۷۲ کروڑ سے بھی زیادہ مظلوم ہیں۔ اب شمر بچ کے نہیں جاتا۔ نہیں جاسکتا۔

اب یزید کی تمام جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوجوں کو حسین کے ساتھی اپنے بظاہر معمولی ہتھیاروں، بالنی کے نیزوں سے شکست دیکر نکال باہر کرتے ہیں.

شمر کی نفسیاتی حکمت عملی کا تلخ تمیع کرنے کے لیئے لاکھوں حر لشکر ابن زیاد سے لشکر حسینؑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات عباس اطہر کی سمجھ میں نہیں آتی۔

کوفے والوں کی بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے عباس کو کہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ عباس جلدی میں تھا وہ چلا گیا۔ وہ کل تک مذاکراتیوں کے پس پردہ تھا آج اس کا بیان چھپا ہے۔ "یوم اتحاد منائیے۔" ابھی اس نے میرے پاس آنے کو کہا ہے جب میں کالم لکھ چکا ہوں گا۔ مجھے عباس اطہر سے پوچھنا ہے۔ "کس کا اتحاد" لشکر شمر" اور" حسین کے مظلوم ساتھیوں کا۔" کیا یہ اتحاد ممکن ہے؟

میری نظر میں اس کی صرف ایک صورت ہے کہ شمر کا سارا لشکر "حر" بن جائے۔

کیا ایسا ممکن ہے مجھے اس سے پوچھنا ہے۔

اگلے ہفتہ اس کا جواب آپ کو بھی بتادوں گا۔

بھٹو کو پریشان کرنے والے خود پریشان ہو جاتے ہیں

بھٹو کا ۱۵ پاؤنڈ وزن کم ہو گیا ہے

جیل کے مکھی، مچھر باہر کی گھٹن محسوس کرتے ہیں

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حوصلے بہت بلند ہیں جب کہ لاہور کے کوٹ لکھپت جیل میں ان کو خراب کھانا فراہم کرنے کے سبب ان کے وزن میں ۵ اپونڈ کی کمی ہو گئی ہے، اس کے علاوہ ان کو طرح طرح کی سختیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور بے عزتی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس بات کا انکشاف باخبر ذرائع نے کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ حال ہی میں مس بے نظیر بھٹو نے اپنے والد سے راولپنڈی جیل میں اپنے والد سے ملاقات کی تھی اور یہ باتیں اس ملاقات میں سامنے آئیں۔

ان ذرائع کے مطابق مس بے نظیر بھٹو ان کے والد اور والدہ الگ الگ شہروں میں نظر بند ہیں حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھ سکتے۔ چیئرمین پنڈی میں ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو لاہور میں اور وہ خود کراچی میں نظر بند ہیں۔ نظر بندی کی ایک مدت ختم ہوتی ہے تو دوسرا آرڈر جاری کر دیا جاتا ہے

ان ذرائع کا کہنا ہے کہ مس بے نظیر بھٹو کا تاثر یہ ہے کہ شاید انہیں آزمایا جا رہا ہے۔ مگر آخر کب تک آزمایا جائے گا۔

ان ذرائع کے مطابق مس بے نظیر بھٹو کی اپنے والد سے آخری ملاقات ۲ جون کو راولپنڈی میں ہوئی تھی اس وقت تو ان کی طبیعت ٹھیک تھی۔ شاید بعد میں ان کو مزید تکلیفیں دی گئیں جس کی وجہ سے انہوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ ان ذرائع نے بتایا کہ اسی طرح لاہور کے کوٹ لکھپت جیل میں بھی چیئرمین کو کھانا چھوڑنا پڑا جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کو جو کھانا ملتا ہے اس سے ان کا وزن کم ہو رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ چیئرمین صاحب کا کوئی ۱۵ پاؤنڈ وزن کم ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے جیل کا کھانا چھوڑ دیا۔

------ پنڈی جیل میں بھی کوٹ لکھپت جیل لاہور کی طرح چھت پوری طرح بند نہیں ہے جس کی وجہ سے جیل کی کوٹھری مکھیوں اور مچھروں سے بھری رہتی ہے۔ جب آنسہ بے نظیر چیئرمین کے ساتھ باتیں کر رہی تھی تو ایک ٹڈا ان کے بالوں میں گھس گیا جس کو انہوں نے جھٹک کر پھینک دیا جس پہ چیئرمین صاحب نے ہنس کر کہا کہ میں تو ان کا عادی ہو گیا ہوں۔ ان کو اندر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ باہر کتنی گھٹن ہے کہ یہ مچھر اور مکھیاں بھی باہر رہنے سے جیل کے اندر رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان ذرائع بتایا کہ جب چیئرمین صاحب سے باتیں ہوتی ہیں۔ تو مشقتی کوٹھری کے دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے، اس کے علاوہ ہمارے خیال میں یہ باتیں ٹیپ بھی کی جاتی ہیں۔ انہی ذرائع نے بتایا کہ چیئرمین صاحب اکثر وقت مطالعے میں گذارتے ہیں، مگر ہمارے محسنوں کو یہ بات بھی پسند نہیں۔ "وہ" چیئرمین بھٹو کی ہر حرکت پہ نظر رکھے ہوتے ہیں۔ ان کو تجویہ لاحق ہے کہ بھٹو صاحب پریشان ہوتے ہیں یا نہیں۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہر تکلیف کے بعد بھٹو صاحب ذرا سا بھی پریشان نہیں ہوتے تو بیچارے "وہ" پریشان ہو جاتے ہیں اور جب یہ رپورٹ اوپر جاتی ہو گی تو وہ بھی پریشان ہوتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوتے ان ذرائع نے بتایا کہ کوٹ لکھپت جیل میں کئی راتیں ایسی گذریں کہ پُراسرار لوگ بھاری جوتوں سے بھٹو صاحب کی کوٹھری کی چھت پر چڑھ کر مشین گنیں وغیرہ کھٹکھٹاتے تھے، حتیٰ کہ بعد میں بھٹو صاحب کو گالیاں تک دی جاتی تھیں مگر یہ دیکھ کر وہ حیران ہو جاتے تھے کہ بھٹو صاحب پورے اطمینان سے مطالعے میں مشغول ہوتے تھے۔

... ناذ آزاد ... کے رہنما جناب معراج محمد خان
نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

معراج نے بھوک ہڑتال اخباری کارکنوں کی اپیل پر ختم کی۔ ۲ جون ۱۹۷۸ء کو اخباری صنعت کے دس رہنماؤں نے ایک مشترکہ بیان میں معراج سے اپیل کی تھی کہ وہ عظیم تر مفادات کے لئے اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ اسی نوعیت کی اپیل ۳ جون کو "یوم احتجاج" کے موقع پر اخباری کارکنوں نے ایک قرارداد کی شکل میں کی تھی۔ دوسری جانب معراج کی پارٹی کے رہنماؤں، کارکنوں کے علاوہ بلوچ رہنما جناب شیر محمد مری اور مزدور کسان پارٹی کے افضل بنگش نے بھی اسی قسم کی اپیلیں کیں۔ معراج اخباری کارکنوں، اپنی پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں اور دوستوں کی خواہشات کو نظر انداز نہ کر سکے۔ اور بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ ورنہ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ "وہ پورے استقلال سے اپنا علم اپنے کندھے پر اٹھا کر منزل کی طرف نکلے ہیں۔ اگر وہ اس راستے پر کام آ گئے تو انہیں یقین ہے کہ ان کا کوئی اور ساتھی اس علم کو اٹھا کر منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔"

جناب معراج پاکستان کے واحد سیاسی رہنما ہیں جنہوں نے کھل کر اخباری کارکنوں کی حالیہ تحریک کی حمایت کی۔ اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اور ان کی پارٹی عملی طور پر اخباری صنعت کے کارکنوں کی جدوجہد میں شامل ہو جائے گی۔ جب کہ پی این اے کے رہنما جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے قبل ... آزادی صحافت اور آزادی اظہار کی مالا جپتے تھے، اخباری کارکن جلوس نکالتے تھے۔ تو وہ ان پر پھولوں کی بارش کرتے تھے۔ ایپنک اور پی ایف یو جے کے قائدین کے گلوں میں ہار ڈالتے تھے۔ اور جماعت اسلامی کے مولوی منور حسن تو ایپنک اور پی ایف یو جے کے قائد جناب منہاج برنا کی تحریروں اور اخباری کارکنوں کی جدوجہد سے اتنے متاثر تھے کہ جیل سے خط لکھا کرتے تھے کہ "آیئے ہمارے ساتھ مل کر جدوجہد کیجئے۔" لیکن جب جناب برنا نے پی این اے اور خصوصاً جماعت اسلامی سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ایپنک اور پی ایف یو جے آزادی اظہار کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اور ہمارا نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق ہے۔ اور نہ ہم اُس سے تعاون کر سکتے ہیں یہ دو ٹوک جواب سُن کر اس وقت تو جماعت اسلامی اور پی این اے کی دیگر جماعتیں خاموش رہیں۔ لیکن جب ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد قومی پریس پر عملاً پی این اے کا قبضہ ہو گیا۔ تو پی این اے "آزادی صحافت" کے مطالبے کو بھول گئی۔ بلکہ اُس نے ایپنک اور پی ایف یو جے کی منتخب قیادت کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ آزادی صحافت کے لئے مصروف جدوجہد تھے اور رہیں۔ مفتی محمود نے اخباری کارکنوں کی حالیہ تحریک کے خلاف بیان دیا۔ اور نو اور "بھٹو ازم" کے مرض میں مبتلا اور لندن میں زیر علاج ولی خان کے جو گذشتہ ۳۱ سال سے "جمہوریت، آزادی صحافت" کے علمبردار بنے ہوئے تھے، پیٹ میں اتنی شدت سے درد اٹھا کہ صحافیوں کی حالیہ تحریک کے خلاف بیان داغ دیا۔ اخبارات کی جبری بندش، نقد زرِ ضمانت جمع کرانے کے نوٹسوں اور پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس جیسے کالے قوانین کی حمایت کر ڈالی۔ اور جواز یہ پیش کیا کہ بھٹو حکومت کے زمانے میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا جواب ہو رہا ہے۔ اس لئے "جائز" ہے۔

جب رجعت پسند سیاستدان مخالفت کر رہے تھے۔ اُس وقت معراج نے نعرۂ حق بلند کیا، غیر مشروط اور مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء کو اخباری کارکنوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا "موجودہ حکومت جس طرح سے صحافیوں کو سزائیں خصوصاً کوڑے لگانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ وہ غیر شرعی اور غیر اسلامی ہیں۔ اور قطعی ناقابل

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

اسلام آباد

ذوالمختار حیدری

سیاسی جماعتیں بھی رجسٹر ہوا کریں گی

آزاد امیدواروں کے انتخاب میں حصّہ لینے پر بھی پابندی لگ جائے گی !

آپریشن فیئر پلے کے بعد کلین اپ شروع

پاکستان میں کتنی سیاسی جماعتیں ہیں ہم اس سوال کا جواب دے ہی نہیں سکتے کہ ہمیں جن جماعتوں کے نام یاد ہیں وہ اس تعداد سے بے حد کم ہے جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاالحق کو یاد ہے۔ ہم نے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بڑے لیڈر نے ایک رکنی جماعتوں کو بھی شامل کر کے تعداد بمشکل بیس تک پہنچائی تھی۔ اس تعداد تک پہنچنے میں بھی ان کے خون کا پسینہ ہوگیا تھا اور وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کر کافی عرصہ صاحب فراش رہے۔ اب بھی اشاروں سے باتیں کرتے ہوں گے۔ بہرحال جنرل ضیاالحق صاحب کا حوصلہ قابلِ داد ہے کہ انہیں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کا علم ہے اور تعداد کے بارے میں بھی وہ پُر یقین ہیں۔ ایک صاحب نائی کی دکان پر گئے۔ نائی نے اُسترا سنبھالا اور شروع ہوگیا۔ صاحب کو ذرا جلدی تھی بولے بھائی بال کتنے۔ نائی بولا۔ جناب جی جلدی کاہے کو مونڈے مانڈے سب آگے کو ہی آئیں گے۔ بس جلدی کیا ہے سیاسی جماعتوں کی تعداد بہت جلد سب کو معلوم ہو جائے گی اور نام بھی کہ ان جماعتوں کی رجسٹریشن کرنے کی تجویز حکومت کے زیرِ غور ہے گویا اب سیاسی جماعتیں بھی ٹریڈ یونین کی طرح رجسٹر ہوا کریں گی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کی تجویز میں یہ بات شامل ہے کہ ایک خاص تعداد تک رکنیت نہ رکھنے والی جماعتوں کو رجسٹر تو کیا جائے گا مگر وہ انتخابات میں بطور سیاسی جماعت حصّہ نہیں لے سکیں گی اسی طرح کی پابندی سُنید ہے کہ آزاد امیدواروں کے بارے میں بھی لگنے والی ہے جو شخص کسی رجسٹرڈ سیاسی جماعت کا رکن نہیں ہوگا وہ انتخاب ہی نہیں لڑ سکے گا۔ جماعت اسلامی کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ رجسٹریشن کے لئے ارکان کی کم سے کم تعداد مقرر کئے جانے کی جو تجویز ہے جماعت کے ارکان کی تعداد اس سے کچھ زیادہ ہی ہوگی گویا رکنیت کی کم سے کم حد کو اس حد تک کم کر دیا جائے گا کہ جماعت اسلامی کو دھچکا نہ پہنچے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن سے کیا مقصد حاصل کیا جائے گا تو اس کا سیدھا سادھا جواب ہے کہ اوّل تو سیاسی جماعتوں کی بڑھتی ہوئی نسل پر اسی صورت میں پابندی لگائی جا سکتی ہے۔

معراج محمد خاں کی حالت نازک ہے

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک بھر میں معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان میں کتنی سیاسی جماعتیں انتخاب لڑنے کی اہل ہیں۔ اس سارے ڈرامے کا اصل فائدہ مخفی ہے اور وہ ہم بتائے دیتے ہیں وہ اصل فائدہ یہ حاصل کرنا مقصود ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے حضرت مولانا کوثر نیازی کی پارٹی رجسٹر ہوگی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے جانثار ساتھیوں کو تو ظاہر ہے کہ اس جماعت میں شامل نہیں کیا جا سکے گا۔ نئی جماعت وہ بنا نہیں سکیں گے کہ اس اقدام پر پابندی لگا دی جائے گی آزاد امیدوار کھڑے نہیں ہو سکیں گے کہ رجسٹریشن ایکٹ کے تحت ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔ مقصد اس ساری ورزش کا یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے صحیح نمائندے انتخاب میں حصّہ ہی نہ لے سکیں۔ اگر وہ پیپلز پارٹی میں شامل کر بھی لئے گئے تو مولوی بھلا کیوں انہیں ٹکٹ ملنے دے گا۔ آزاد وہ کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔ نئی جماعت بنا نہیں سکیں گے کسی دوسری جماعت میں اوّل تو کوئی انہیں شامل ہی کیوں کرنے لگا اور اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی گیا تو انہیں وہاں ٹکٹ کون لینے دے گا۔ تو صاحبو مثبت نتائج حاصل کرنے کی طرف یہ رجسٹریشن ایکٹ ایک مثبت اور ٹھوس قدم ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر ذوالفقار علی بھٹو کے جانثاروں کو جیتنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ اور یہ صورتحال کچھ لوگوں کو کیا سب کو ہی کسی قیمت پر بھی منظور نہیں ہے کہ اس میں سراسر گھاٹا اور نقصان ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا

تو جولائی میں پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی.

ہم خان عبدالولی خان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ملک میں مارشل لاء لگنے کے ایک سال سے بھی کم عرصہ میں اس کی حقیقت سے پردہ اٹھا دیا. یہ بات کوئی اور کہتا تو ہم اعتبار بھی نہ کرتے. خان عبدالولی خان اور ساتھیوں کو اس مارشل لاء سے جس قدر فائدہ ہوا ہے وہ اور کسی جماعت کے حصہ میں نہیں آیا. خان عبدالولی خان نو ماہ تک کہتے رہے کہ اگر مارشل لاء نہ لگتا تو ملک تباہ ہو جاتا. خانہ جنگی چھڑ جاتی اب انہوں نے لندن میں ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جنرل ضیاء الحق مارشل لاء نہ لگاتے تو ذوالفقار علی بھٹو ان کو اور ان کے چند ساتھیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیتے.

قومی محاذ آزادی کے سربراہ معراج محمد خان کی اٹک جیل میں بھوک ہڑتال جاری ہے. ان پر نقاہت کا شدید عالم طاری ہے. ان کی اہلیہ نے گزشتہ دنوں اٹک جیل میں ان سے ملاقات کی. معراج کو بے ہوشی کے انجکشن لگا کر غذا شیشن کے ذریعہ پیٹ میں پہنچائی جا رہی ہے. معراج محمد خان کی یہ بھوک ہڑتال آزادی صحافت اور صحافیوں کے مطالبات کی حمایت میں جاری ہے. ان کی حالت سخت نازک ہے. جیل کے ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں. معراج محمد خان کو سی کلاس میں رکھ کر قیدیوں کے کپڑے پہنائے گئے ہیں. جب ان کی ملاقات کے لئے بیگم زبیدہ گئیں تو جیل حکام نے کہا. معراج کو پڑھنے کے لئے اگر کوئی رسالہ وغیرہ دینا ہے تو وہ سیارہ ڈائجسٹ یا اردو ڈائجسٹ کے سوا کوئی اور نہ ہو. معراج محمد خان کی آنکھوں میں مسلسل درد ہے. بیگم زبیدہ معراج نے مارشل لاء حکام سے اپیل کی ہے کہ ان کے خاوند کو کراچی منتقل کیا جائے. کیونکہ ان کے اہل خاندان کے علاوہ ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر جمعہ خان اور ڈاکٹر کرنال کراچی میں ہیں. معراج محمد خان کے دماغ میں رسولی ہے اور انہیں آنکھوں کی تکلیف بہت عرصہ سے ہے جس کے علاج کے لئے وہ جولائی میں باہر جانا چاہتے تھے. مگر راولپنڈی میں اخبار نویسوں سے ایک غیر رسمی بات چیت کے بعد ٹرسٹ کے ایک بہت بڑے اخبار نویس کی رپورٹ پر حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا. اور ایک سال کے لئے جیل میں بند کر دیا ہے.

آزادی صحافت کے جس محاذ پر معراج محمد خان ڈٹے ہوتے ہیں وہ بڑا عظیم محاذ ہے. ہم نے آپریشن فیئر پلے کی کامیابی کے بعد جس آپریشن کلین اپ کی خبر دی تھی، اس پر کام شروع ہو گیا ہے. آغاز اخبارات سے ہوا ہے، آزادی صحافت کی جدوجہد میں حصہ لینے والے صحافیوں کو ٹرسٹ کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے اب اس آپریشن کا دائرہ ذرا وسیع کر دیا گیا ہے. راولپنڈی یونین آف جرنلسٹ کے صدر مسٹر حسن اختر کو جو مارننگ نیوز کے بیورو چیف تھے ملازمت سے اس لئے برطرف کر دیا گیا ہے کہ چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ مسٹر جمیل الزمان جالندھری نے فیصلہ کیا ہے کہ دار الحکومت میں مارننگ نیوز کا سینیئر کارسپانڈنٹ نہ ہو. انہوں نے اس آسامی کو فالتو قرار دے کر ختم کر دیا ہے. اسامی کے ساتھ ساتھ مسٹر حسن اختر اس لئے فالتو قرار پا گئے کہ وہ آر یو جے کے صدر تھے. وہ وقتی طور پر بی بی سی کے لئے باقاعدہ اجازت طلب کرنے کے بعد کام کرتے تھے. اجازت نامہ کے ساتھ وہ لندن ٹائمز کے لئے بھی لکھتے تھے اگر وہ یہ کام نہ کرتے اور آر یو جے کی صدارت سے علیحدہ ہو جاتے تو ان کی اسامی فالتو نہ قرار دی جاتی. مسٹر جمیل الزمان جالندھری کے مشیر خاص مسٹر حبیب الرحمٰن عرف "پھینے" کی بڑک کامیاب رہی ہے. آپریشن فیئر پلے کا دائرہ مزید وسیع ہو گا. مقبوضہ اخبارات سے مزید ناپسندیدہ عناصر نکال دیئے جائیں گے. اپنے ڈھب کے آدمیوں کو آگے لایا جائے گا مگر تابکے.

رجعت پسند صحافیوں کی آج کل بن آ رہی ہے. ٹرسٹ کے اخبارات میں بھی جو برخوردار قسم کے صحافی ہیں ان کے بھی مزے ہیں. حکومت کو اخبار نویسوں کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا تو پولیس کیوں پیچھے رہتی. راولپنڈی کے ایس ایس پی بہت مرنجان مرنج اور شریف قسم کے انسان ہیں اور سرکاری ملازم کی صحیح تعریف. یعنی وہ مالک کے ملازم ہیں بینگن کے نہیں. کراچی کے ایک رجعت پسند اخبار کے نمائندہ نے ایس ایس پی صاحب کو فون کیا کہ دو خواتین سے سیٹلائٹ ٹاؤن میں اچکوں نے پرس چھین لیا ہے اس میں ایک ہزار روپے کی رقم تھی. یہ رقم علاقے کے تھانیدار سے دلوائی جائے. ٹرسٹ کے اخبار کے ایک برخوردار قسم کے صحافی نے بھی ایس ایس پی کو اسی قسم کا فون کیا! ایس ایس پی صاحب نے فوراً نیو ٹاؤن کے تھانیدار سے کہا کہ ان کا نقصان پورا کر دو. تھانیدار صاحب نے ایک ہزار روپے نقد سکہ رائج الوقت تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا. دونوں اخبار نویسوں کی بات مان لی گئی. تھانیدار صاحب نے یہ ہزار روپے ظاہر ہے کہ اپنی جیب سے ہی نہیں دیتے ہوں گے کہ ان کو اتنی تنخواہ چھ ماہ میں ملتی ہو گی ظاہر ہے کہ اس کے لئے چھری غریبوں کی گردن پر ہی چلی ہو گی. جو تھانیدار ایک ہزار روپے ایک اشارے پر اچانک دے دے اس کی تھانیداری کا کیا کہنا، علاقہ بھی کیسا سیٹلائٹ ٹاؤن کا جو شرفا کی بستی ہے اگر ایسا ویسا علاقہ ہوتا تو لمبی ہی رقم بھی مل جاتی. تھانیدار اور پولیس والوں کو رشوت لینے پر مجبور کرنے والے اصحاب کس طرح رشوت کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں. یہ حقیقت سب کے علم میں ہے کہ پولیس کا عام اہلکار بھی لمبی رشوت لیتا ہے اس کا علم یوں ہوا کہ مسٹر بھٹو نے جب اقتدار سنبھالا تو انہوں نے دوسرے محکموں کی طرح پولیس کے محکمہ کے لئے بھی ایک کمیشن مسٹر جی. احمد کی سربراہی میں مقرر کیا. مسٹر جی احمد کراچی میں اخبار نویسوں سے مل رہے تھے. ایک اخبار نویس نے کہا آپ رشوت کی روک تھام کے لئے کوئی تجویز نہیں مانگ رہے. مسٹر جی احمد نے کہا آپ کے پاس کوئی تجویز ہے. اخبار نویس نے کہا بالکل. تجویز یہ ہے کہ تھانیدار اور سپاہیوں کی تنخواہ اتنی مقرر کر دی جائے کہ وہ اپنی ضروریات بآسانی پوری کر سکیں. پھر وہ رشوت نہیں لیں گے. مسٹر جی احمد نے کہا. آپ کی تجویز اپنی جگہ پر مگر یہ بھی حقیقت سن لیں کہ ہر ایک ڈی ایس پی کے تحت تقریباً ۳۰ تھانے ہوتے ہیں ہر تھانیدار ڈی ایس پی کو ایک ہزار روپے ماہوار (کم از کم) فراہم کرتا ہے. تو یہ ڈی ایس پی صاحب ہر ماہ یہ رقم گھر بیٹھے مفت پاتے ہیں انہوں نے اخبار نویس سے سوال کیا. آپ ڈی ایس پی کی تنخواہ کتنی مقرر کرنے کی تجویز کرتے ہیں کہ وہ یہ رقم نہ لیا کرے انہوں نے یہ بھی کہا کہ جو تھانیدار ہر ماہ ایک ہزار روپے بلا مانگے ڈی ایس پی کو دیدے وہ اپنے لئے بھی کم از کم اپنے علاقے سے ہی چار پانچ ہزار روپے ماہوار تو بچاتا ہو گا. ظاہر ہے کہ وہ یہ رقم خود جا کر نہیں لیتا اپنے ماتحتوں سے وصول کرتا ہے تو ماتحت بھی جتنی رقم تھانیدار کو دیتے ہوں گے اس سے دگنی تو اپنے لئے ضرور رکھتے ہوں گے. مسٹر جی احمد کی یہ ہولناک حقیقت سننے کے بعد اخبار نویس اپنا سا منہ لے کر خاموش رہ گئے. اس کے سوا چارہ بھی کچھ نہیں تھا.

حسین شیروانی

پی آئی اے

پروازیں ریکارڈ تاخیر اور سنگین خدشات

معاملہ انجینئرنگ کے
شعبے میں تنخواہوں پر
امن نے کہا ہے

مسافر بھی پریشان، ملازمین بھی پریشان

انتظامیہ کو حاصل تھی انجینئرز نے اُس سے محروم کر دیا اور جہازوں کو ایئرکرافٹ مینول (جہازوں کی مرمت اور مینٹیننس کا ہدایت نامہ) کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کیا جب ایئرکرافٹ مینول کے مطابق عمل شروع ہوا تو پی آئی اے جو نہایت مصروف شیڈول رکھتی ہے کی تمام پروازیں تاخیر کا شکار ہونے لگیں۔ اور اس طرح پی آئی اے کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں انجینئرز کا استدلال ہے کہ وہ دیدہ دانستہ تاخیری حربے GOS LOW نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ مینول میں وضع اصولوں کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ اور جہاز کو بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کے مطابق چیک کر رہے ہیں چونکہ پرواز کے لئے انجینئرز کو ہی سرٹیفکیٹ جاری کرنا پڑتا ہے اس لیے خود انجینئرز کا بین الاقوامی ضابطے کے تحت اطمینان ضروری ہوتا ہے اور اگر اس عمل میں تاخیر ہو جاتی ہے' تو اس میں انجینئرز ذمہ دار قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ایک انجینئرز نے بتایا کہ ایک جہاز اگر پرواز کے اسٹینڈ نمبر ۱۸ پر کھڑا ہے اور اس کے پریشر نہ بننے کی رپورٹ ہے تو انجینئرز اسے ضابطہ مینول کے مطابق رن اپ پوائنٹ PUN UP POINT پر لے جائیں گے پہلے اسے چیک کریں گے پھر نقص تلاش کر کے دور کریں گے پھر چیک کریں گے۔ اور پھر O.K کی رپورٹ دیں گے۔ سٹینڈ ۱۸ سے رن اپ پوائنٹ تک جانے کے لیے جہاز ۵ میل سے زائد نہیں چلایا جا سکتا۔ چنانچہ نصف سے ایک گھنٹہ تو صرف اس عمل کے لیے چاہیئے اول اور آخر ٹیسٹوں میں بھی بے پناہ وقت صرف ہوتا ہے چنانچہ تاخیر کی ذمہ داری انجینئرز پر عائد نہیں کی جا سکتی۔

تاخیری حربے طویل ہوئے تو انتظامیہ کے ایک گروہ نے سازشیں شروع کر دیں۔ اور انتظامی نااہلی کو چھپانے کے لیے اس ساری گڑبڑ کی ذمہ داری انجینئرز کی سینئر ایگزیکٹو پر ڈال دی اور مختلف حربوں کے بعد وہ گروہ جو پی آئی اے میں لوُٹنگ کمیشن گروپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے ایک عرصے سے انجینئرنگ میں آنا چاہتا تھا اس میں کامیاب ہو گیا۔ انجینئرنگ کے ڈائریکٹر مسٹر فضل ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر اختر، سینئر چیف انجینئر مسٹر ریاض، چیف انجینئر مسٹر منظور محمود، چیف انجینئر مسٹر فاروق اعظم اور چیف انجینئر مسٹر بابر کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ انہیں تبدیل کیا گیا معطل اور جبری رخصت پر بھیج دیا گیا۔ اور مسٹر اعجاز علی جو برسوں سے اس کوشش میں تھے اب انجینئرنگ کے ڈائریکٹر بنا دیئے گئے ہیں اس پر بحث نہیں کرتا کہ ان تبدیلیوں سے انجینئرنگ کے ملازمین کس درجہ مشتعل ہیں۔ اور دیواروں پر کس کو ٹھاہ کی تحریریں درج ہیں میں اصل موضوع پر لوٹتا ہوں۔

اس سے قبل کہ اس نقصان کا جائزہ لیا جائے جو تاخیری حربوں کے نتیجے میں پی آئی اے کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے بہتر یہ ہے کہ انجینئرز کے مطالبے کو بھی سامنے رکھا جائے جو بات اس وقت وجہ تنازعہ ہے وہ پائلٹوں کی تنخواہ کا ۵۰۔ ۵۵ فیصد کا مطالبہ ہے پائلیٹ جو کہ بین الاقوامی تنظیم کا حصہ ہیں، اس لئے انہیں اپنی بات منوانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی، لیکن باقی طبقوں کو ہمیشہ کچھ لینے کے لئے پی آئی اے سے محاذ آرائی کرنی پڑتی ہے۔ ایک پائیلٹ کی اوسطاً تنخواہ ۱۴ ہزار بنتی ہے' جب کہ انجینئرز اس وقت اوسطاً تین ہزار لیتے ہیں۔ اگر ان کا مطالبہ مان لیا جائے تو ان کی تنخواہوں میں اوسطاً ۵ ہزار روپے کا اضافہ ہوگا۔ یہ مطالبہ پاکستان جیسی غریب مملکت میں کہاں تک جائز ہے اس سے قطع نظر یہ نقصان جو اس مطالبے کو منوانے کے سلسلے میں ہو رہا ہے' یقیناً مطالبے سے زیادہ ہے۔ پہلا نقصان تو جہاز کو سٹینڈ سے رن اپ پوائنٹ پر لے جا کر ٹسٹ کی صورت میں اٹھانا پڑ رہا ہے' جہاں انجینئرز لاکھوں روپے کا پٹرول جلا کر نقص کی تلاش کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اب تک انجینئرز کے مطالبے کی رقم سے نصف تک اس پٹرول پر خرچ ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ مسافروں پر خرچ کی جانے والی رقم کا دیکھا جائے، تو شاید اس مطالبے سے کئی سو گنا زیادہ رقم ضائع ہو رہی ہے۔ ایک پرواز جس نے صبح ۷ بجے لاہور جانا تھا وہ شام ½۷ بجے روانہ ہوتی۔ اگر وہ وقت پر روانہ ہو جاتی، تو اس میں صرف ناشتہ کا خرچ پی آئی اے کو اٹھانا پڑتا۔ لیکن ۱۲ گھنٹے کی تاخیر کے سبب ناشتہ' دوپہر سے قبل تواضع، لنچ، دوپہر کے بعد تواضع اور پھر رات کا کھانا ڈنر۔ اس طرح صرف ایک جہاز جس پر دو صد مسافر اندرون ملک سفر کر رہے ہیں، ان پر اخراجات کا تخمینہ ۳۰ ہزار سے ۴۰ ہزار بنتا ہے اور جب یہی تاخیر کراچی نیویارک پرواز پر ہوتی ہے' تو اخراجات کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ طیارہ کراچی سے نیویارک تک جتنے ایئرپورٹوں پر اترتا ہے۔ نقصانی تاخیری خرچہ اسی نسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر پاکستان کے غریب عوام کا محنت و مشقت سے کمایا ہوا یہ زرمبادلہ جو پاکستان میں آنا چاہیئے، وہیں اس تاخیر کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہ نقصان ہزاروں لاکھوں اور پھر کروڑوں میں بدل جائے گا۔

کیا پی آئی اے کی انتظامیہ کا تلاش کیا ہوا یہ حل اس مسئلے کو سلجھانے میں مددگار ثابت ہوگا؟ کیا چند آفیسروں کو نکالنے سے یہ مسئلہ طے پا جائے گا۔ ہمارے خیال میں پی آئی اے کی انتظامیہ کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ کہ جس تعصب اور سازش کے ذریعے ان آفیسروں کو نکالا گیا ہے' اس نے نفرت کی نئی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ اس لئے کہ نکالے جانے والے تمام آفیسران کا تعلق پنجاب سے ہے (مشرقی پنجاب سے نہیں)۔ اور پی آئی اے کا ایک ناعاقبت اندیش طبقہ صوبائی عصبیت کے حوالے سے ایک لسانی گروہ کی کامیابی کے دعوے کر رہا ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ان انجینئرز کو ان کی ذات کے حوالے سے دیکھیں، تو صاف نظر آئے گا کہ یہ آفیسران تعصب کی نذر ہوتے ہیں مثلاً مسٹر اختر جو ڈپٹی ڈائریکٹر انجینئرنگ تھے۔ وہ اپنے شاندار ریکارڈ کی بنا پر بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ اور ان کی عالیہ ایئرلائن اور مالٹا کی ایئرلائنز کے قیام میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اور وہ وہاں کی سینئر ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز تھے۔ خود پی آئی اے میں انجینئرنگ کو یہاں تک پہنچانے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا ہے، اب خود نااہل انتظامیہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح مسٹر ریاض جن کی پوری ملازمت بے داغ اور شاندار ہے، جو سٹاف اور آفیسرز میں یکساں شہرت رکھتے ہیں' بھی اس کاٹ کی زد میں آ گئے۔ یہ طبقہ جو صوبائی عصبیت کا بیج بو رہا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس کی پشت پر ایک مخصوص نظریہ کام کر رہا ہے، لیکن وہ پی آئی اے یا ملک کی کیا خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ یہ سوال براہ راست اس ادارے کے سربراہ نور خان سے کیا جا رہا ہے جو نیچے کی رپورٹوں پر آنکھ بند کر کے صاد کر رہے ہیں کیا تنخواہوں میں اضافہ جیسا معمولی مسئلہ ضروری ہے کہ حل ہونے کی بجائے کروڑوں روپے کے ساتھ پی آئی اے کی شہرت کے لئے بھی زبردست اور ناقابل تلافی نقصان

(باقی صفحہ ۴۶ پر)
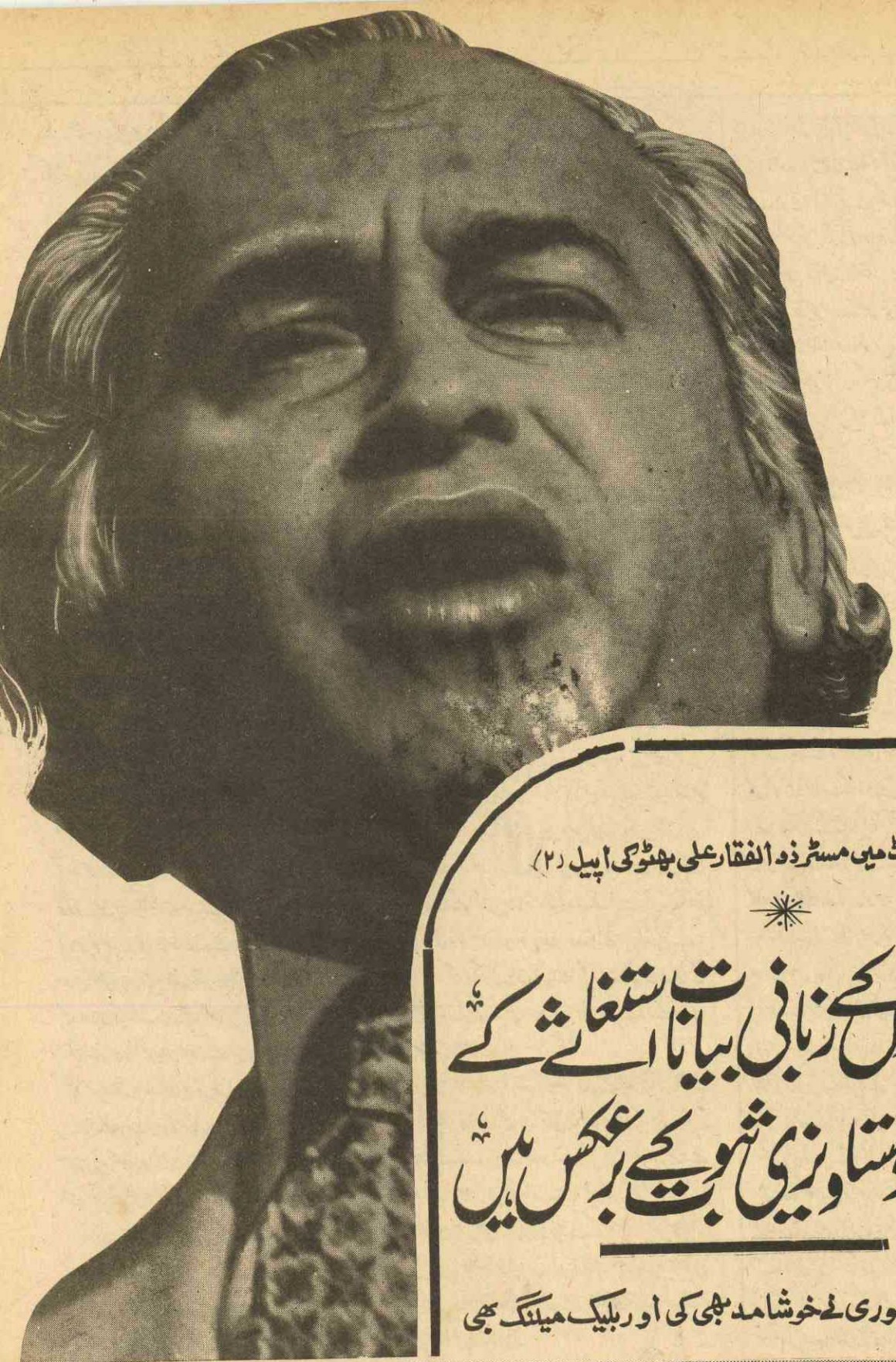
سپریم کورٹ میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل (۲)

بعض گواہوں کے زبانی بیانات استغاثہ کے ریکارڈ اور دستاویزی ثبوت کے برعکس ہیں

احمد رضا قصوری نے خوشامد بھی کی اور بلیک میلنگ بھی

۲۷۔ اسی طرح اگر استغاثے کے کسی گواہ نے صفائی کے حق میں کوئی بات کہدی تو سماعت کرنے والی بنچ نے کسی نہ کسی بہانے اس شہادت کو مسترد کر دیا استغاثے کے گواہ ۲۸ عاشق محمد لودھی نے اپنی گواہی میں کہا تھا اقبالی مجرم غلام حسین کا اقبالی مجرم مسعود محمود سے براہ راست رابطہ تھا اور وہ دونوں جولائی ۱۹۷۴ء میں تقریباً پون گھنٹے تک مؤخر الذکر کے دفتر میں بند رہے تھے مسعود محمود اور غلام حسین دونوں نے کہا تھا۔ کہ ان کے درمیان کبھی براہ راست رابطہ نہیں رہا۔ مگر سماعت کرنے والی بنچ نے فیصلہ کیا کہ ایک رسمی گواہ کی حیثیت میں استغاثے کے گواہ ۲۸ کا کام نہیں تھا کہ وہ ایسی گواہی دے جس کی نوعیت صفائی حق میں ایک سہولت کی ہو۔

مگر سماعت کرنے والی بنچ نے دوسرے تمام رسمی گواہوں کی ایسی شہادتیں قبول کرلی ہیں جہاں جہاں وہ استغاثے کے حق میں گئی ہیں استغاثے کے گواہ ۲۸ عاشق محمد لودھی کی شہادت کے وہ حصے جو رسمی نوعیت کے نہیں تھے لیکن استغاثے کے حق میں جاتے تھے اور سماعت کرنے والی عدالت کے فیصلے کے پیش نظر جنہیں زیر غور نہیں لایا جاسکتا تھا انہیں فیصلے میں اپیل کنندہ کے خلاف باضابطہ طور پر زیر غور لایا گیا ہے یہ بات انتہائی نمایاں ہو گئی کہ سماعت کرنے والی بنچ نے مقدمے کی کارروائی کے پورے دوران میں دوہرے معیار کو اصول بنا لیا۔ اور انہوں نے اس اصول پر عمل کیا کہ یکساں صورت حال میں استغاثے کے لیے ایک قانون نافذ کیا جائے گا۔ اور صفائی کے لیے دوسرا۔

(۲۸) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے قانون شہادت کی دفعہ ۳۲ سے غلط معنی نکالنے کی غلط راہ پر خود کو ڈالتے ہوئے سنی سنائی شہادتوں کو قبول کیا ہے۔ عبدالاحد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، عبدالحمید باجوہ، اسسٹنٹ چیف سیکیورٹی آفیسر اور حق نواز ٹوانہ، سابق ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف، مقدمے کی کارروائی شروع ہونے سے کافی عرصہ قبل فوت ہو چکے تھے۔ استغاثے کی شہادت میں چند اہم خلاؤں کو پُر کرنے کے لیے چند گواہوں نے ان مردہ لوگوں سے چند بیانات منسوب کیے۔ قانون شہادت کی دفعہ ۳۲ کے خود سماعت کرنے والی بنچ کے اخذ کردہ معانی (جس سے اپیل کنندہ کو اتفاق نہیں ہے) کی رو سے بھی اور ان بیانات ان کے انطباق میں بنچ نے اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ مردہ افراد سے منسوب بیانات کا تجزیہ کیے بغیر اور اس بات پر غور کیے بغیر ان بیانات کے کن حصوں پر بنچ کے مرتب کردہ اصول کا اطلاق ہوتا ہے اور کن کن حصوں پر نہیں ہوتا۔ انہیں جوں کا توں قبول کر لیا ہے اس امر نے بھی اپیل کنندہ کے مقدمے پر مضر اثر ڈالا ہے۔

(۲۹) کہ کثیر یا قابل قبول شہادت کو مقدمے کے ریکارڈ پر لایا گیا ہے جسے قانون شہادت کی دفعہ ۷ اور / یا دفعہ ۱۱ کے تحت بھی ریکارڈ پر نہیں لایا جاسکتا تھا۔

(۳۰) جب کبھی بھی ناقابل قبول نوعیت کی شہادت مقدمے کے ریکارڈ پر لائی گئی۔ وکیل صفائی کے اعتراضات کو، بعض اوقات انہیں ضبط تحریر میں لانے کے باوجود کسی حکم کے بغیر نمٹایا گیا۔ بعض صورتوں میں اعتراضات کو مسترد کرنے کے احکام جاری کیے گئے تو اس استرداد کے حق میں کوئی سبب نہیں بتایا گیا۔

(۳۱) کہ استغاثے کے بعض گواہوں کے زبانی بیانات خود استغاثے کے پیش کردہ ریکارڈ اور دستاویزی ثبوت کے برعکس ہیں۔ اس کے باوجود استغاثے نے زور دیا کہ اس کا اپنا ریکارڈ اور دستاویزات مسترد کر دیئے جائیں اور گواہوں کے زبانی بیانات قبول کر لیے جائیں سماعت کرنے والی بنچ نے سادہ طریقے پر ان درخواستوں کو منظور کر لیا۔ اور وہ تمام دستاویزات مسترد کر دیں جو صفائی کے حق میں تھیں۔

(۳۲) کہ زبانی بیانات کے ذریعے استغاثے نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک مخصوص تاریخ کو لکھی جانے والی دستاویز حقیقتاً اس تاریخ کو نہیں لکھی گئی تھی۔ اور ایسی زبانی شہادت جو دستاویز کے مواد کے برعکس تھی قبول کر لی گئی کیونکہ دستاویز بذات خود صفائی کے حق میں جاتی۔

(۳۳) کہ استغاثے کے گواہوں اور دوسرے فریقین کے بیانات ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت قلمبند کرتے وقت ذیلی دفعہ ۱-۲۱ لازمی تصریحات کو دانستہ طور پر نظر انداز کر دیا گیا جس سے اپیل کنندہ کو سخت نقصان پہنچا اور سماعت کرنے والی بنچ ایسے بیانات اور شریک ملزمان کے اقبالی بیانات پر غور کرتے وقت اس بے قاعدگی پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ذیلی دفعہ ۱-اے میں درج ہے۔

"ایسا کوئی بیان کوئی ایسا مجسٹریٹ ملزم کی موجودگی میں قلمبند کر سکتا ہے اور ملزم کو بیان دینے والے گواہ پر جرح کا موقع دیا جاسکتا ہے"۔

(۳۴) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر شریک ملزموں کے ان اقبالی بیانات پر غور کیا جو انہوں نے عدالت کے روبرو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت دیئے تھے، جس کے بارے میں اپیل کنندہ کو کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا تھا کہ اس دفعہ کے تحت اپیل کنندہ کا بیان دوسرے شریک ملزمین سے پہلے لیا جا چکا تھا یہ انصاف کی ناکامی پر منتج ہوا۔

(۳۵) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر اور بغیر کسی جواز کے بارودی اسلحہ کے ماہر کی منفی رپورٹ کو مسترد کر دیا جس نے استغاثے کے مقدمے کو ملیامیٹ کر دیا۔ تھا اور یہ فیصلہ کرنے کی غلطی کی ہے کہ اس جرم کے ارتکاب میں مبینہ طور پر استعمال ہونے والی گنیں برآمد نہیں ہوئی تھیں۔ سماعت کرنے والی بنچ نے استغاثے سے یہ دریافت کرنے کی پرواہ نہیں کی کہ اگر بارودی اسلحہ کے ماہر کو بھیجی جانے والی گنوں کا تعلق تقابل کے مقصد سے نہیں تھا۔ تب آخر انہیں کس غرض سے جرم سے متعلق خولوں کے ساتھ بارودی اسلحہ کے ماہر کو بھیجا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ استغاثہ نے تھرڈ بٹالین سے متعلق تمام ۲۵ گنیں بھیجی تھیں جن میں سے دو گنیں مبینہ طور پر اس جرم کے ارتکاب میں استعمال کی گئیں تھیں۔ استغاثے کو توقع تھی کہ موجودہ مارشل لا کی فضا میں اس معاملے میں موافق رپورٹ حاصل کر لے گا لیکن جب رپورٹ منفی نکلی تو اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ ایسی تمام دستاویزات اور شہادتوں کو دبا دیا جائے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ تھرڈ بٹالین سے تعلق رکھنے والی گنیں استغاثے کے مقدمے کو ثابت کرنے کی خاطر معائنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔

(۳۶) (ا) کہ اپیل کنندہ کے محرک کے بارے میں بھی استغاثے کی شہادت متضاد ہے۔ ایک طرف تو استغاثے کا مقدمہ یہ ہے کہ ۳ر جون ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی سے اپیل کنندہ کے خطاب کے دوران احمد رضا قصوری کی مداخلت نے اس جرم کے لیے محرک فراہم کیا۔ دوسری طرف ریکارڈ پر ایسی شہادت لائی گئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کا بہت پہلے سے محرک موجود تھا۔

(ii) جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ایف آئی آر اور چارج میں بتایا گیا تھا کہ قومی اسمبلی میں ۳ر جون ۱۹۷۴ء کے واقعے نے جرم کے لیے محرک فراہم کیا تھا لیکن استغاثے کی پیش کردہ دوسری شہادت اس سے متصادم ہے۔ اور نشاندہی کرتی ہے کہ اپریل ۱۹۷۴ء میں مسعود محمود کو ترغیب دی گئی، تنگ کیا گیا۔ دھمکی دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ فیڈرل سیکیورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ قبول کریں تاکہ وہ احمد رضا قصوری کو ختم کرنے کے اپیل کنندہ کے مبینہ منصوبے پر عملدرآمد کیا۔ ایسی نمایاں عدم مطابقتوں نے سماعت کرنے والی بنچ سے کوئی توجہ حاصل نہیں کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بنچ نے محرک کے بارے میں چارج اور ایف آئی آر میں تسلیم کردہ استغاثے کی شہادت کو نظر انداز کیا گیا ہے اس کے برعکس بنچ نے پیراگراف ۵۶۳ میں قرار دیا ہے کہ اپیل کنندہ "احمد رضا قصوری کی اس پر تنقید کی سبب گینے کی وجہ سے ایک محرک رکھتا تھا"۔ احمد رضا قصوری کی تنقید میں اس

نام نہاد کینے کا تعلق ۳ جون ۱۹۷۴ء سے بہت عرصہ پہلے کی قومی اسمبلی میں ان کی تقریروں سے ہے۔

(iii) سماعت کرنے والی بنچ نے ایسے محرک پر زور دے کر خود کو غلط راہ پر ڈالا ہے جو نہ ممکن تھا نہ اس کی نوعیت ایسی تھی۔ جو ایسے فرد کے خلاف مبینہ جرم کا تقاضا کرتی ہو جو بقول چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر "غیر اہم شخص" تھا۔

(iv) سیاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کو بے حساب زہر آلود قسم کی تنقید برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اپیل کنندہ کافی عرصے سے حکومت میں ہونے کی بنا پر اس کا عادی تھا۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کا گذشتہ اٹھارہ سالہ ریکارڈ اس بات کا ثبوت دے گا کہ قومی اسمبلی کے کہیں زیادہ اہم اراکین اپنی تقریروں میں اس سے زیادہ کینہ پروری کے ساتھ اپیل کنندہ پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ان اراکین اسمبلی سے خوشگوار تعلقات رکھے۔

(v) محرک پر غور کرتے ہوئے سماعت کرنے والی بنچ احمد رضا قصوری کے کردار اور طمع کا اندازہ کرنے میں ناکام رہی جو سارا وقت حکومت میں عہدہ حاصل کرنے یا دوسرے فوائد حاصل کرنے کے لیے اپیل کنندہ سے بھیک مانگتا رہا۔ اسے تنگ کرتا رہا اور بلیک میل بھی کرتا رہا۔

(vi) اگر اپیل کنندہ کو ذرا برابر بھی احساس جرم ہوتا تو احمد رضا قصوری کو حکومت میں کوئی معمولی عہدہ دے کر خاموش کرنا اس کے لیے دنیا میں سب سے آسان بات ہوتی۔ مگر اپیل کنندہ نے انہیں قومی یا صوبائی اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لیے پارٹی ٹکٹ کے لیے موزوں نہیں سمجھا جبکہ اپیل کنندہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے سینکڑوں امیدواروں کو ٹکٹ دے سکتا تھا۔ قومی اسمبلی کے لیے ٹکٹ دینے سے انکار کرنے کے بعد بھی احمد رضا قصوری نے خوشامد اور بلیک میلنگ سمیت اپنی چالیں اس امید پر جاری رکھیں کہ شاید سینیٹ کے انتخابات میں ان پر توجہ دی جائے لیکن یہ بھی خارج از بحث تھا۔ یہ ان کی مایوسی اور اپریل ۱۹۷۷ء میں دوبارہ اپیل کنندہ کی پارٹی چھوڑنے کی وضاحت کرتی ہے۔ ان تمام باتوں پر سماعت کرنے والی بنچ نے غور نہیں کیا۔

(vii) احمد رضا قصوری کی یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ کئی افراد ایسے تھے جو ان کے دشمن تھے اور جو اسلام آباد کے واقعے کے ساتھ ہی ساتھ لاہور کے واقعے کے بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپیل کنندہ کو انہیں ہلاک کرنے کے محرک سے بری قرار دیا تھا جیسا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹریبونل کی رپورٹ سے ظاہر ہے جو ان کے والد کی ہلاکت کے معاملے کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کے اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو اپنے بیان میں انہوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یقیناً انہوں نے عدالت کے روبرو اپنے بیان میں اس سے انکار کیا اور سماعت کرنے والی بنچ نے صرف تکنیکی وجوہات کی بنا پر اس انکار کو قبول کر لیا کہ ٹریبونل کی رپورٹ قابل قبول نہیں اور اسلام آباد کے واقعہ کے بعد پولیس کے روبرو بیان جو صفائی کو خود استغاثہ نے فراہم کیا تھا ثابت نہیں ہوا۔

(viii) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے غیر قانونی طور پر یہ قرار دیا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن ٹریبونل کی رپورٹ قابل قبول نہیں۔ اس کے باوجود بنچ نے اس کے مواد پر انحصار کیا۔ جیسا کہ استغاثے کے گواہ ۳ سعید احمد نے الزام لگایا کہ رپورٹ مخالفانہ تھی اس لیے اپیل کنندہ نے اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ عدالت اپیل کنندہ کی مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کی درخواست بھی غیر قانونی طور پر مسترد کر دی جس میں گذارش کی گئی تھی کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کو بیان دینے کے لیے بطور گواہ طلب کیا جائے تاکہ رپورٹ کے پیراگراف ۱۵ میں محولہ احمد رضا قصوری کے بیان کی ثانوی شہادت دی جا سکے۔ اسی طرح بنچ نے اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو دیئے گئے۔ احمد رضا قصوری کے بیان کو استغاثہ کے گواہ ۲۳ کے ذریعے ثابت کرنے کی اجازت نہ دے کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

(ix) کہ ایک طرف تو استغاثہ مصر ہے کہ قومی اسمبلی میں ۳ جون ۱۹۷۴ء کا واقعہ اپیل کنندہ کے لیے محرک کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے باوجود ۲۴ اگست ۱۹۷۴ء کو یعنی اسمبلی کے واقعے کے ۷/۶ ہفتے بعد جب مبینہ طور پر احمد رضا قصوری پر گولیاں چلائی گئیں تو انہوں نے اپیل کنندہ کو ملوث نہیں کیا۔ نہ ہی انہوں نے یہ کہا کہ اپیل کنندہ کے ایما پر ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ انہوں نے کئی افراد کا ذکر کیا جو گولیاں چلانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ قومی اسمبلی کے واقعے کے فوری بعد پیش کی جانے والی تحریک استحقاق میں انہوں نے ایسا کوئی الزام نہیں لگایا۔ اس کے پیش نظر یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ لاہور کے واقعے کے بعد ایف آئی آر تقریباً تین گھنٹے تک درج نہیں کرائی گئی اور اب محسوس ہوتا ہے کہ صلاح مشورے ہوئے اور اس کے بعد اپیل کنندہ کا نام ایف آئی آر میں شامل کیا گیا۔

(x) احمد رضا قصوری نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے ۱۹۷۲ء کے اوائل میں اپیل کنندہ سے سمجھوتہ کر لیا تھا کیونکہ اپیل کنندہ نہ صرف صدر بلکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی بن گیا تھا۔ اور خوف کی بنا پر انہیں اپیل کنندہ کی طرف وہ ظاہری رویہ اپنانا پڑا۔ اور جیسے ہی مارشل لا اٹھا لیا گیا تو انہوں نے اپیل کنندہ کو دوبارہ اپنے دانت دکھائے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے ان کے خوف کو سامنے رکھتے ہوئے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ مخالفانہ فضا میں جس میں سی ایم ایل اے نے بار بار اسی مقدمے میں اپیل کنندہ کو قاتل کہا ہے اور شہادتیں گھڑنے اور جوڑ توڑ کرنے کے لیے مارشل لا کی مشینری حرکت میں لائی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین کو تنگ کیا گیا اور ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ جھوٹے بیانات دیں۔ احمد رضا قصوری نے کیونکہ نہ صرف لاہور کے واقعے کی ذمہ داری ڈالی بلکہ اسلام آباد کے واقعے کے بعد پولیس کے روبرو دیئے گئے اپنے بیان اور مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹریبونل کے سامنے دیئے گئے اپنے بیان سے بھی انکار کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں ۱۹۷۱ء کے واقعے کے سبب کی بھی ذمہ داری اپیل کنندہ پر ڈالی گو کہ اس واقعے کا ریکارڈ صاف صاف نشاندہی کرتا ہے کہ وہ یعقوب مان اور قصور کے دوسرے مقامی لیڈروں سے دشمنی رکھتے تھے۔

(۳۷) کہ وقت نے پوری طرح یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نہ صرف اپیل کنندہ کو ذاتی مخالف کی حیثیت سے ہٹا دینے اور اپنی مطلق العنانہ حکومت کو جاری رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اب انہوں نے اپنے مارشل لا کی ایک نظریاتی یا فلسفیانہ تشریح کرنی شروع کی ہے۔ انہوں نے پچھلے دنوں خود کو دائیں بازو والا قرار دیا ہے جیسا کہ ہٹلر، مسولینی اور فرانکو نے خود کو دائیں بازو والا قرار دیا تھا۔ اور جو کوئی بھی سماجی انصاف، قومی ملکیت میں لینے اور عام آدمی کی فلاح و بہبود میں یقین رکھتا ہے وہ اسے بائیں بازو والا قرار دے رہے ہیں۔ وہ یہ کہنے کی حد تک گئے ہیں کہ سارے بائیں بازو والے ایک جیسے ہیں اور یہ کہ دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں میں جنگ جاری ہے۔ انہوں نے

(باقی ص ۳۹ پر)

اس ہفتے کراچی پھر "غیر رسمی" سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ "غیر رسمی" اس وجہ سے کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے جب کہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمی "غیر رسمی" کی آڑ میں جاری ہے۔ بشرطیکہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو، جب کہ حکومت کو اعتراض فقط "بھٹو ازم" پر ہے۔ ہر ایسی سرگرمی حکومت کے زیرِ عتاب آسکتی ہے جس کا دُور سے بھی "بھٹو کرنٹ" سے واسطہ ہو جو اس وقت ملک کے سیاسی منظر پر چھایا ہوا ہے۔ یہ "کرنٹ" ۵ جولائی سے منظر پر ظاہر ہوا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو یہ کرنٹ ملک سے باہر لندن تک پہنچ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خان عبدالولی خان بمع بیگم صاحبہ لندن میں موجود ہیں تاکہ اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اب تو اصلی تے وڈے حکیم اور سی ایم ایل اے صاحب کے مشیر جناب مولا بخش سومرو بھی لندن پہنچ گئے ہیں۔ شاید اب سیاسی مشکلات کا مقابلہ "کُشتوں" کے ذریعے کرنے کا فارمولا آزمایا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ مولا بخش سومرو صاحب کشتے بنانے کے ماہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے ہر حاکم کی آنکھوں کا سُرمہ بنے رہے۔ ایوب خان کے تو خاص الخاص میں شامل تھے۔

لندن میں خان عبدالولی خان اور مولا بخش سومرو کی ملاقاتوں کی اطلاعات آ رہی ہیں، جب کہ دوسری طرف ملک کے اکثر سیاسی رہنما کراچی پہنچ گئے ہیں، ان میں سردار عبدالقیوم، میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد، چودھری ظہور الٰہی، ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان قابلِ ذکر ہیں۔ مگر ان سب سے پہلے جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی بیرونِ ملک سے کئی ماہ کا دورہ مکمل کر کے کراچی پہنچ چکے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے کچھ عرصہ پہلے جب پی این اے سی ایم ایل سے ملاقات کر رہی تھی تو جمعیت کو اتنی لفٹ بھی نہیں کرائی گئی کہ جمعیت کے رہنماؤں کو سی ایم ایل اے سے ملاقات کا دعوت نامہ جاری کیا جاتا حالانکہ اس وقت جمعیت کے رہنما شاہ فرید الحق کو یہاں تک کہنا پڑا کہ اگر حکومت کی طرف سے ہمیں دعوت نامہ ملا تو ہم ضرور ملاقات کریں گے۔ مگر حکومت کی طرف سے جمعیت کو مکمل طور پر پی این اے اور بقول مولانا نورانی یو ڈی ایف کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مگر شاید اب وقت بدل گیا ہے۔ گذشتہ دو تین روز

سے ایک سیاسی رہنما مولانا نورانی کے یہاں آتا ہے تو دوسرا جاتا ہے۔ سُنا ہے کہ پی این اے والوں کو اچانک جمعیت کی اہمیت کا زبردست احساس ہو گیا ہے۔ وہ ہر حال میں جمعیت کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اس "احساس" کا ایئر مارشل صاحب کو علم ہو گیا تھا جو بغیر کسی پروگرام کے کراچی پہنچ گئے۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ بھائی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اصغر خان کسی پروگرام کے بغیر کراچی وارد ہوتے ہیں۔ جب کہ باوثوق ذریعوں کا کہنا ہے کہ ان کے آنے کا مقصد فوری طور پر نورانی میاں سے ملاقات کرنا تھا۔ مسٹر اصغر خان کی آمد کے ساتھ ہی مولانا نورانی اور تحریک استقلال کے سیکریٹری جنرل مسٹر مشیر احمد پیش امام کے درمیان ملاقات ہوئی جو غیر متوقع طور پر کافی دیر تک جاری رہی۔ دوسرے دن ایک اور "قاصد" اسلام آباد سے سیدھے کراچی پہنچے اور مولانا شاہ احمد نورانی اور جمعیت کے دوسرے رہنماؤں سے ملاقات کی۔ ملاقات چل ہی رہی تھی تو اخباری نمائندے بھی پہنچ گئے۔ جمعیت کے رہنما بہت خوش تھے۔ اخباری نمائندوں سے اپنی "خوشی" کا اظہار کرنے کے لئے ایک صاحب باہر آتے تھے تو دوسرے اندر جاتے تھے۔ اپنے شاہ فرید الحق سے رہا نہ گیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہ کیا چوہدری ظہور الٰہی بھی آپ سے ملاقات کے لئے کراچی آتے ہوتے ہیں۔ تو شاہ جی کے منہ سے نکل گیا کہ "اب تو آپ دیکھیں گے ہر ایک ہمارے پاس آئے گا۔" اسی دوران جمعیت کے ایک اور رہنما مولانا محمد حسین حقانی آ گئے اور اخبار والوں کی ان سے گپ شپ شروع ہو گئی۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ ان لوگوں سے تو آپ کی ملاقاتیں ہو رہی ہیں، باقی "اصل لوگوں" سے ملاقات کب ہو گی تو وہ "اصل لوگوں" کا مطلب سمجھ نہ سکے۔ انہیں جب بتایا گیا اصل لوگوں سے مراد حکمرانوں سے ہے تو حقانی صاحب نے مزہ لے کر جواب دیا کہ "پہلے طبیعت تو ٹھیک ہو جائے پھر ملاقات بھی ہو جائے گی۔" اس کے بعد حقانی صاحب نے بہت ہی معنی خیز جملہ کہا کہ "وہ بھی ایک فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں اور ہم بھی ایک فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں"

انہوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔

آخر ملاقات ختم ہوئی اور اخباری نمائندوں کو اندر بلایا گیا۔ مولانا نورانی اور جمعیت کے رہنماؤں نے خاموشی اختیار کی اور اشارہ کیا گیا کہ سردار قیوم سے ہی بات چیت کی جائے۔ سردار صاحب نے عام قسم کی باتیں کیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ اُن کا کراچی کا دورہ اور مولانا نورانی سے ان کی ملاقات کسی خاص مقصد کے لئے نہیں تھی۔ کافی عرصے سے ان کی نورانی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی سو وہ ملنے آ گئے۔ مگر باوثوق ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ اسلام آباد سے ایک خاص پیغام مولانا نورانی کے لئے لے کر کراچی آئے تھے۔ ان ذرائع کے مطابق حکومت اور پی این اے کے رہنماؤں کی طرف سے یہ آخری کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ پی این اے سے الگ نہ ہوں۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ مسٹر اصغر خاں کو اکیلا کر کے تحریکِ استقلال

سے ہوا نکال دی جائے۔ اس سلسلے میں اطلاعات کے مطابق جمعیت العلمائے پاکستان کو کچھ پیش کشیں بھی کی گئی ہیں تو کچھ خطرات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ ان ذرائع کے مطابق اگر جمعیت نہ مانی تو اس کے رہنماؤں کے خلاف "احتساب" شروع ہو سکتا ہے۔ ویسے سردار قیوم کی ملاقات کے بعد اخباری نمائندوں نے مولانا نورانی کے چہرے پر سوچ کی کافی معنی خیز لکیریں ابھرتی محسوس کیں ادھر اخباری نمائندوں سے بات چیت کے دوران مولانا نورانی کی موجودگی میں سردار عبدالقیوم ایک خاص قسم کا ہلکا سا تاثر دیتے رہے کہ وہ جمعیت کے بارے میں مفتی محمود اور پروفیسر غفور احمد کے موقف سے مکمل طور پر خوش نہیں ہیں۔ پتہ نہیں ہے کہ یہ ان کا تاثر حقیقی تھا یا یہ فقط اس "مشن" کو کامیابی سے مکمل کرنے کے لئے دیا گیا تھا جس کے لئے انہیں خاص طور پر اسلام آباد سے کراچی بھیجا گیا تھا۔

بہر حال، مولانا شاہ احمد نورانی نے جمعیت العلمائے پاکستان کے ملک بھر کے رہنماؤں کا ایک اہم اجلاس ۳ جون کو کراچی میں طلب کیا ہے، خیال ہے کہ اس میں کئی اہم فیصلے کئے جائیں گے جن کا ملک کی آئندہ سیاسی صورتحال پر اثر پڑے گا۔

۳۱ مئی کو مسلم لیگ کے رہنما چودھری ظہور الٰہی نے

کراچی مسلم لیگ کے ایک رہنما ہارون احمد کے گھر پر مسلم لیگ کے کارکنوں کے اجلاس سے خطاب کیا جس میں خواجہ خیر الدین، عمر سیلیا، علی کوثر اور دوسرے کئی مسلم لیگی رہنما موجود نہیں تھے۔ بہر حال چودھری صاحب بہت خوش تھے۔ جناح ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریر کے دوران کہا کہ کراچی جیل میں مجھے کافی عرصہ بند وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اس بات پر نزدیک بیٹھے ہوئے دو مسلم لیگی کارکنوں نے کھسر پھسر کی کہ "یار جھوٹ بول رہا ہے، ہم بھی اس وقت جیل میں تھے۔ بلکہ چودھری صاحب تو ایک دن کے لئے بھی بند وارڈ میں بند نہیں کئے گئے" مگر بعد میں ان میں سے ایک صاحب کو احساس ہوا کہ اخباری نمائندے ان کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے، تو کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ایک صاحب نے پلٹ کر کہا "یار سیاست میں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے"۔ اجلاس میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کچھ رہنماؤں نے مطالبہ کیا ان کو کافی رقم دی جائے تاکہ وہ بائیں بازو کی طلبا تنظیموں کا مقابلہ کر سکیں۔ چودھری صاحب نے بعد میں اس سلسلے میں ان طلبا سے الگ اجلاس کیا اور خیال ہے ان کا مطالبہ کافی حد تک پورا کر دیا گیا۔ بہر حال تقریر کے دوران چودھری صاحب نے کہا کہ ایک بار مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں وہ مختلف مسلم لیگی رہنماؤں سے ان کے علاقے میں ان کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹ پوچھ رہے تھے تو اس رہنما نے اشارتاً ان سے رقم کا تقاضا کیا۔

بہر حال چودھری صاحب نے نوید سنائی کہ بہت جلد خیبر سے کراچی تک فقط مسلم لیگ ہی مسلم لیگ ہوگی۔ چودھری صاحب نے ایک اور انکشاف کیا اور کہا کہ خان عبدالقیوم خان اپنی مسلم لیگ کو ہماری مسلم لیگ میں ضم کرنے کے لئے اپنی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کرنا چاہتے تھے مگر افغانستان میں انقلاب کے بعد جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کے پیش نظر انہوں نے مجلس عاملہ کا اجلاس کئے بغیر اپنی مسلم لیگ کو ہماری مسلم لیگ میں ضم کر دینے کا اعلان کر دیا۔ چودھری صاحب نے بہر حال اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ افغانستان کے انقلاب سے مسلم لیگ کے لئے کون سا خطرہ پیدا ہو گیا اور "خطرہ" کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کو متحد کرنا کیوں لازمی تھا۔

پہلی مئی کو تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے تحریک کے سیکرٹری جنرل مشیر احمد پیش امام کی آفس میں اخباری نمائندوں سے غیر رسمی طور پر بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ موجودہ حالات کو خاموشی سے بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم حالات کا رُخ تبدیل کر کے نیا رُخ متعین کریں گے۔ انہوں نے حکومت کو رمضان کے مہینے تک کی ڈیڈ لائن دی کہ رمضان تک انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اصغر خان نے کہا کہ رمضان ایک مقدس مہینہ ہے۔ "مجھے یقین ہے کہ سی ایم ایل اے صاحب جو وعدہ رمضان میں کریں گے اس پر ضرور عمل درآمد کریں گے"۔ مگر یہاں کے سیاسی حلقے رمضان کی ڈیڈ لائن کو اور معنی پہنا رہے ہیں۔ ان حلقوں کے مطابق رمضان کے ماہ تک سپریم کورٹ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے کا فیصلہ سنا دے گی جس میں امکان ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا جائے گا ان حلقوں کے مطابق اس فیصلہ پر عمل درآمد کے بعد مسٹر اصغر خاں کے خیال میں پیپلز پارٹی ایک قوت کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد تحریک استقلال ایسی قوت ہو گی جو سیاسی حالات کا رُخ متعین کر سکے گی۔

مسٹر اصغر خان نے اپنی اخباری بات چیت میں انکشاف کیا کہ انہوں نے مولانا نورانی سے ملاقات کے دوران "ایک صاحب" کے رویے پر بھی غور کیا اور اس سلسلے میں دونوں فریقوں میں ہم خیالی تھی! اصغر خان صاحب نے اس "صاحب" کا نام ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی اس کی واضح نشاندہی کی مگر سیاسی حلقوں کے مطابق ان کا اشارہ کسی چھوٹے موٹے نہیں مگر کسی بڑے صاحب کی طرف تھا۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ اس صاحب کا تعلق ہمارے ملک کے "بڑوں" سے ہے۔ جب کہ کچھ اور حلقوں کا خیال ہے کہ اس "صاحب" سے مُراد شہنشاہ ایران تھے۔ سینٹو کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں مسٹر اصغر خاں نے کہا کہ ہمیں نئی صورت حال کے پیش نظر اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ سینٹو کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں اپنے پرانے حلیفوں ایران اور ترکی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ سابق وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اپنے آخری دنوں میں سینٹو کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے سلسلے میں ایران اور ترکی سے صلاح مشورے کر رہے تھے۔

ایک منظم احتجاجی مہم کا جواب کوڑوں کی زبان میں دیا گیا

پاکستان میں کشیدگی بڑھ رہی ہے ——!

دی اکنامسٹ ۲۰ مئی ۷۸ء

جناب بھٹو کی سزائے موت کے خلاف اپیل کی سماعت کے اختتام پر، پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء کو داخلی سطح پر ہم آہنگی اور بین الاقوامی سطح پر ہم خیال دوستوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہر چیز جو غلط جا سکتی تھی غلط سمت میں جا چکی ہے صحافیوں اور پبلشروں پر سخت رویے کی وجہ سے بڑے نہیں انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں، کمزور سیاسی اتحاد جو کہ جنرل ضیاء نے تجویز کیا تھا کہ وہ "قومی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اب راستے ہی میں ڈھیر ہو چکا ہے افغانستان کے انقلاب سے لوگوں کے حوصلوں کو شدید دھچکا لگا ہے جو کہ پہلے ہی بہت زیادہ پست حوصلہ اور مایوس تھے اور اب عدلیہ جو کہ گزشتہ ہفتے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی زبردست تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھیں اب ایک بار پھر آزمائش میں ہے۔

گزشتہ ہفتے کے وسط میں کال کوٹھڑی کی صورتحال پر جناب بھٹو کی دبی دبی احتجاجی آواز سنائی دی جیسا کہ ان کے وکیل نے بھی کہا کہ ان حالات میں وہ مقدمے کی کارروائی سے قبل ہی مر جائیں گے جو راولپنڈی میں ایک قدیم برطانوی جیل میں رکھے گئے ہیں انہیں ایک خصوصی تعمیر کردہ کنکریٹ سیل میں رکھا گیا ہے جس کی ایک کھڑکی سے وہ پرائم منسٹر ہاؤس کو دیکھ سکتے ہیں جہاں انہوں نے چھ سال تک حکومت کی تھی انہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ شخص ان کا دشمن ہے کھڑکی کے قریب بیٹھ کر یہ احساس ایک ذہنی اذیت ہے۔ کہ وہ اب فوج کی گرفت میں ہیں۔

ان کی اپیل کی سماعت سپریم کورٹ کے ۹ ججوں پر مشتمل ایک فل بنچ کر رہی ہے اور اس بات کی توقع ہے کہ اس میں تقریباً تین مہینے لگ جائیں گے یہ کارروائی ان اعتراضات کے ساتھ شروع ہوئی کہ چیف جسٹس انوار الحق غیر جانبداری سے مقدمے کی صدارت نہیں کر سکتے جناب بھٹو نے اپنے ایک خفیہ خط میں جو انہوں نے چیف جسٹس کے نام لکھا تھا۔ اس اعتراض کی وجہ بنیاد بنایا کہ گزشتہ ماہ آپ نے صدر مملکت کی عدم موجودگی میں مملکت کے قائم مقام صدر کے فرائض انجام دیئے چیف جسٹس انوار الحق کے اس اقدام نے ملک کی انتظامیہ اور عدلیہ کو یکجا کر دیا جس سے قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ چار مواقعوں پر چیف جسٹس نے ریلی تقریروں کے ذریعے جناب بھٹو اور پیپلز پارٹی پر حملے کیے۔ لہٰذا جناب بھٹو اور ان کے وکیل یحییٰ بختیار کیوں نہ اس بات پر متفکر ہوں کہ کیا یہ عدلیہ بھی لاہور ہائیکورٹ کی طرح جس نے دو ماہ قبل انہیں سزائے موت سنائی تھی کس طرح کم جانبدار ہو سکتی ہے؟ لیکن چیف جسٹس نے ان خدشات کی وضاحت کر دی ہے۔

مقدمے کی کارروائی سے قبل ان دنوں ملک میں شدید کشیدگی کی فضا پائی جاتی ہے فوج اور پولیس کے دستے بھاری تعداد میں راولپنڈی میں کورٹ کی حفاظت اور جناب بھٹو کو آزاد کرانے کی کسی بھی کوشش کو رد کرنے کے لیے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ مظاہروں اور جلوسوں پر بدستور پابندی عائد ہے گزشتہ دو ہفتوں کے دوران صحافیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک برتا گیا ایسا نظر آتا ہے کہ جنرل ضیاء۔ اور ان کے ساتھی جرنلوں میں کسی طرح کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی اب سکت نہیں ہے۔

تقریباً ایک سو پچیس صحافی جس میں چار ایڈیٹر بھی شامل ہیں جیل میں تین ماہ سے ایک سال کی قید بامشقت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ایک منظم احتجاجی مہم کا جواب جنرل ضیاء نے جیل اور کوڑوں کی زبان میں دیا۔ جو گذشتہ ماہ کے شروع میں پاکستان کے صحافیوں کی فیڈریشن اور اخباری صنعت کے کارکنوں کی انجمن نے شروع کی تھی صحافی برادری مساوات لاہور بند کیے جانے پر احتجاج کر رہی تھی جبکہ جناب بھٹو کا حامی ایک ممتاز اردو روزنامہ ہے اور جس پر حال ہی میں سابق وزیر اعظم کی سزا کے خلاف توہین آمیز مواد چھاپنے کا الزام تھا۔ لہٰذا اس اخبار کو بند کر دیا گیا

اور اس کے پرنٹر اور دو ایڈیٹروں کو جیل بھیج دیا گیا۔

ملک کی موجودہ ناخوشگوار فضا میں اس وقت سے کشیدگی بڑھتی جارہی ہے جب ۳۰ اپریل کو چھ صحافیوں نے مساوات کو بند کرنے کے خلاف احتجاجی بھوک ہڑتال کا آغاز کیا تھا ان صحافیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے علاوہ سولہ دوسرے افراد بھی گرفتار کر لیے گئے جو مساوات کے سیل شدہ آفس میں داخل ہونے کی کوششیں کر رہے تھے صحافیوں کے ان گروپوں کو وکیلوں کی موجودگی کے بغیر ہی مختلف سمری ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا۔ جہاں سے ان میں سے بعض کو لاہور بدر کر دیا گیا۔ اور بعض دوسرے صحافیوں کو سزائیں سنادی گئیں۔ روزنامہ ڈان کے نمائندے نثار عثمانی کو ایک سال کی قید بامشقت اور جرمانے کی سزا سنادی گئی۔

اس دن سے تقریباً ہر روز چار صحافیوں کا گروپ مساوات کے دفتر کے سامنے بھوک ہڑتال کو پہنچتا اور پولیس انہیں گرفتار کر کے فوجی میجر کے سامنے پیش کرتی۔ جہاں انہیں صفائی کا موقعہ فراہم کیے بغیر سزا سنائی جاتی ہے ان چار میں پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے سب چیف ایڈیٹر بھی شامل تھے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے پاکستان میں وحشیانہ سزاؤں کو انتہائی ظالمانہ اور غیر معمولی قسم کی سزائیں قرار دیا ہے۔

جمہوریت کیلئے بھٹو کی زندگی ضروری ہے

سنڈے ٹائمز ۲۱ مئی ۷۸ء

اس ہفتے کے اختتام پر سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو، اپنے ملک کی سپریم کورٹ میں سزائے موت کے خلاف اپیل کر رہے ہیں جو ان پر حال ہی میں ایک سیاسی مخالف کے قتل کی سازش میں مسلط کی گئی ہے بظاہر اس اپیل کی کامیابی کے خلاصے ٹھوس قانونی گراونڈ نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مسترد ہو جاتی ہے تو پھر ہر حال میں ملک کی موجودہ فوجی حکومت کے لیے اپنے انصاف کے سخت تصور میں نرمی پیدا کرنا پڑے گی اور اپنے بڑے سیاسی حریف کو محدود رحم کے ساتھ البتہ جیل ہی میں زندہ رکھنا پڑے گا۔ فوجی جنتا جس کے سربراہ جنرل ضیاالحق ہیں قوم کے سامنے اپنی تمام تر توجہ پاکستان میں جمہوریت بحال کرنے پر مرکوز رکھنے کا سختی سے عہد کر چکے ہیں لیکن جمہوریت ایک شخص کو ہمیشہ کے لئے سیاسی منظر عام سے ختم کر دینے کے بعد فروغ حاصل نہیں کر سکتی۔ البتہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک بڑی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے قابل بنالیا ہے۔ اور خصوصاً جیسا کہ انہیں سیاسی منظر عام سے ختم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا اس قانونی لوازمات کے باوجود بھی بہت سی حسرتیں باقی رہ جائیں گی

جنرل ضیاءالحق اپنے اس بیان پر سختی سے عمل پیرا ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلے میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی عدلیہ" ان کا یقین ہے کہ مکمل آزاد ہے۔ لیکن حقیقتاً" ۔۔۔۔ ہوگا۔ ایسی بہت سی ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ بھٹو کے چھ ماہ کے مقدمے کی کارروائی میں سیاسی پہلو بہت واضح تھے۔ خود جنرل ضیاءالحق نے بدقسمتی سے مقدمے کی کارروائی سے قبل اور کارروائی کے دوران بہت سے ریمارکس دیئے جو کہ بظاہر فیصلے اور سزا دونوں پر اثر انداز ہونے کے مرتکب ثابت ہوئے۔

صفائی کی کارروائی کا بند کمرے میں ہونا اس بات کی ایک واضح شہادت ہے جس کی وجہ سے مقدمے کے بارے میں باہر سے کوئی فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ ایک طویل فیصلہ جس پر اپیل کا انحصار ہے بہت سے قانونی نقطوں کو پیچیدہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، لیکن ایسے نکات جیسے بعض اہم دستاویزات اور شہادتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اور جسے بھٹو کے وکلاء ایک اہم دستاویزات کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ تجویز کہ دھمکی کے ثبوت کو سازش کے الزام میں ثابت کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ ایک شخص کی جان کی بازی لگی ہے۔ انصاف کا ہونا بہت ضروری ہے

بہر حال پاکستان کی نیک نامی اسی میں ہے کہ جناب بھٹو کی سزائے موت پر عمل درآمد روک دیا جاتے۔

اخبار نویس جیل میں گندگی صاف کر رہے ہیں

کوڑے سہنے والے
اقبال جعفری
پکوڑے کھانے والے
محمود جعفری

ہنستا ہوا چہرہ

جیل کا مہمان نثار عثمانی، حکومت کا مہمان مولانا عثمانی

جناب حسین نقی نے زیر نظر کالم گذشتہ ہفتے کے شمارے کے لئے لکھا تھا۔ انہوں نے اسے ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء کو پی آئی اے ایر ایکسپریس کارگو میں بک کرایا۔ "پی آئی اے باکمال لوگ لاجواب پرواز" کا کرشمہ دیکھیے کہ یکم مئی ۱۹۷۸ء کو شام چھ بجے تک ادارے والے کراچی پی آئی اے کارگو والوں سے اس ڈسپیچ کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ اور ہمیشہ یہی جواب ملا کہ "آپ کا کوئی پریس میٹر نہیں ہے"۔ اس کے بعد ہم نے لاہور میں حسین نقی صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اُن سے پی آئی اے کا ڈسپیچ نمبر لیا۔ اور پھر کراچی کارگو کو نمبر بتایا تو جواب ملا کہ "ہاں! ہمیں آپ کا پریس میٹر مل گیا ہے منگوا لیجیے"۔ پی آئی اے کے باکمال لوگوں اور لاجواب پرواز کی بدولت ہمیں یہ کالم اتنی تاخیر سے ملا کہ گذشتہ شمارے میں شائع نہیں کیا جاسکا۔ (ادارہ)

حسین نقی

کھپرو کے بارہ صحافیوں نے پی ایف یو جے اور اپینک کی حکومت کے ساتھ محاذ آرائی کی مذمت کردی ہے۔

کراچی کے اکیاون صحافیوں نے اپنے برادر صحافیوں اور پریس ورکروں سے اپیل کی ہے کہ وہ "جال میں نہ پھنسیں اور قلم کی حرمت برقرار رکھیں ......"

ہارون آباد، ٹنڈو باگو، شیخوپورہ، چیچہ وطنی، گنڈا سنگھ والا قسم کی جگہوں سے بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوتی ہیں اور ہمارے ذمہ دار نشریاتی اداروں یعنی ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن کے مختلف اسٹیشنوں نے ان میں سے اکثر کو انتہائی سعادتمندی سے نشر کیا ہے اور اپنی CREDIBILITY میں بے پناہ اضافہ کر لیا ہے حکومت کی پریس پالیسی کامیابی سے رائے عامہ ہموار کر رہی ہے اور لوگ سوا آٹھ بجے پابندی سے بی بی سی کا اردو بلیٹن سن رہے ہیں۔ میں، ایک پاکستانی اخبار نویس ایک بار پھر پاکستان کی سرکاری پریس پالیسی بنانے والوں کے فہم و دانش

اور اپنے اخبار نویس ہونے پر شرمسار ہوں۔

پچھلے پندرہ سال سے میں اسی قسم کی بانجھ پریس پالیسی کے نتیجہ میں خبر، سچائی، حتیٰ کہ اپنے وطن کا قلع قمع ہوتے دیکھتا رہا ہوں، لکھتا رہا ہوں اور اب میں وقت سے پہلے گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر کا مشورہ ہے میں گردن جھکا کر لکھنا چھوڑ دوں، پڑھنا میں پہلے ہی چھوڑ چکا ہوں "تاکہ میرے عہد طالبعلمی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کم از کم کراچی یونیورسٹی میں اپنا "اسلامی تعلیمی نظام" نافذ کرسکیں۔

مجھے ذاتی طور پر میجر جنرل مجیب الرحمٰن، مسٹر احمد حسن شیخ (جو بحمداللہ بھٹو صاحب اور اب جنرل ضیاء صاحب دونوں ہی حکمرانوں کے دور میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر رہے اور ہیں) اپنے ہم مشرب خان یوسف جمال خان اور ہر حکومت کے معتمد جناب جمیل الزماں سے کوئی ذاتی عناد نہیں اور نہ شکایت ہے۔ بلکہ مجھے ان پر رحم اور ان کی حالت زار پر ترس آتا ہے۔ کہ یہ سب کیا کچھ کرنے کے لیے ہمہ وقت کمربستہ ہیں۔ کوئی بھی ان مجاہدوں میں ایسا نہیں جو کھل کر اپنی عاقبت نا اندیشی کا اعتراف کرے۔

ان کے ساتھ ہی ساتھ مجھے نسیم احمد، خالد حسن اور اپنے ہم مکتب طاہر محمد خان کی عقلمندیاں بھی یاد آتی رہتی ہیں۔ اور ان سے پہلے والوں کی بھی جن کی ایک طویل فہرست میرے ذہن کے مختلف گوشوں میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔

اب یہ اکیاون صحافی دیکھیے جو کراچی سے متعلق ہیں اور میری ہی برادری کے اصحاب ہیں بلکہ کئی ایک میرے دوست بھی، فرماتے ہیں بھائیو جال میں نہ پھنسو (کس کے؟)

قلم کی حرمت برقرار رکھو !!! قلم، حرمت !!

ابھی ابھی میرے ایک اور دوست اور پی یو جے کے قائم مقام صدر جناب محمود جعفری نے فون فرمایا۔ ان کے مطابق اخباری صنعت سے بائیں بازو کی قیادت کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ آج شام کچھ ہونے والا ہے۔ انہوں نے تقریباً پورے ہفتہ بھر بعد مجھ سے گفتگو فرمائی تھی۔ ان کے بقول منہاج برنا اخباری صنعت کے راسپوٹین ہیں۔ اگر راسپوٹین واقعی کوئی ہنس مکھ اور انگریزی میں HANDSOME آدمی تھا تو واقعی مجھے اس پر بڑی خوشی ہے کہ منہاج برنا میں دونوں خصوصیات موجود ہیں۔

ہوٹل فلیٹیز کے کمرہ ۲۷ میں جہاں پی یو جے اور اب پو یو جے۔ ایپنک کی نام نہاد مذاکراتی ٹیم سرکاری خرچ پر مقیم ہے۔ محمود جعفری مجھے دعوت دے رہے تھے۔ میں ان سے خبر کا طالب تھا۔ جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ تم اسے " برنا اینڈ کمپنی " کو بتادو گے۔ اس لیے ہم نے تم کو اب تک خبر نہیں دی۔

یہ اخبار نویس ہیں۔ میں نے اخبار نویس محمود جعفری کو کہا کہ اپنے تمام مشکل دنوں میں ہر سیاسی دھڑے نے مجھ پر اور اس شہر میں نثار عثمانی کے علاوہ کم اخبار نویسوں پر اپنی خبر کے سلسلہ میں بھروسہ کیا ہے۔ بھٹو نے بھی ۶۹-۱۹۶۸ء میں اور ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد والوں نے بھی، تحریک استقلال والوں حتیٰ کہ جماعت اسلامی والوں نے بھی جنہوں نے ۶۹-۱۹۶۸ء کے سال میں پی پی آئی سے میری برطرفی کی تحریری مہم چلائی تھی اور کامیابی حاصل کی تھی۔

ان " مذاکرات " سے پہلے اسی مذاکراتی ٹیم کے حضرات علی الاعلان پریس کلب میں یہ کہہ رہے تھے کہ ہم پی ایف یو جے اور ایپنک کی منتخب قیادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم گرفتاریاں پیش کریں گے۔ ہم حکومت کے اس پروپیگنڈے کو کند کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری قیادت مذاکرات نہیں چاہتی۔ سہالہ میں گرفتار شدہ قومی اتحاد کے لیڈروں اور بھٹو حکومت کے مذاکرات کا حوالہ دیتے اور یہ کہتے تھے کہ ہم حکومت سے کہیں گے کہ وہ قیادت سے مذاکرات کرنے کی حامی بھرے۔ مختلف جیلوں میں قید اور کراچی سے منہاج برنا کو بلائے۔ مساوات کو بحال کرے۔ مقید اور سزا یافتہ اخباری کارکنوں کو رہا کرے اور ان کو ملازمتوں پر بحال کرے۔

نثار عثمانی

یہ کہہ رہے تھے ہمارے درمیان کوئی یعنی اخباری کارکنوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم سب متحد ہیں۔ ہم اتحاد سے اس مسئلہ کو حل کریں گے۔

محمود جعفری اور رشید صدیقی تو خیر اس سے پچھلے تمام عرصہ میں لاتعلق رہے لیکن محترم نسیم الحق عثمانی اور رشید چودھری تو اس سے پہلے مساوات کے دفتر میں پی ایف یو جے۔ ایپنک اور حکومت کے درمیان مذاکرات کی ناکامی کے بعد مساوات میں کافی گرم تقریریں فرما رہے تھے۔

رشید چودھری جو محمود جعفری اور رشید صدیقی کو "بزدل برساتی مینڈک" کہتے اور ان "بزدلوں" سے نمٹنے کے کرتب بیان کرتے۔ آج کل کمرہ ۲۷ فلیٹیز ہوٹل میں مقیم ہیں۔ گو کراچی اخبار ڈان کے دفتر میں کام کرتے ہیں لیکن موصوف کا گھر لاہور میں ہے۔ گھر میں پچھلے ہفتہ سے انہوں نے قیام نہیں فرمایا۔

جب انہیں ایپنک کے صدر اور مردود دربار گاہ وزارت اطلاعات جناب منہاج برنا نے کراچی طلب کیا تو وہ "ٹیلے" پھر مذاکراتی ٹیم میں شامل ہو نے اسلام آباد ائیرپورٹ سے نشر بازی حملہ شروع کرنے کے بعد خود اپنی قیادت کو وارننگ دینے لگے۔ اب موصوف کی اپنی یونین نے ان کو جو ہدایات دی ہیں، اس پر وہ کیا کارروائی فرماتے ہیں' دیکھنا ہے۔

نسیم عثمانی' ایپنک کا کوثر نیازی

ادھر تمام معتبر ذرائع سے تصدیق ہو چکی ہے کہ مسعود اللہ خاں کو سزا سنائے جانے کے بعد جب پتہ چلا کہ وہ معذور ہیں تو انہیں کوڑے نہیں لگائے گئے۔ ان کی اکڑی ہوئی ٹانگ نے ان کا ساتھ دیا۔

لیکن تین صحافیوں کو جو معذور نہیں تھے کوڑے لگے اور تاریخی ریکارڈ بہر حال قائم رہا۔

اس کے بعد کسی صحافی کو کوڑے نہیں لگے اور میرے لیے میرے ایک جماعتی (جماعت اسلامی کے) دوست کا جن کا میں نام لکھ کر ان کو پریشانی میں گھروانا نہیں چاہتا۔ یہ ہدیۂ تبریک ایک اعزاز سے کم نہیں کہ میں نے کم از کم تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص صحافیوں کو کوڑے کی سزا رکوانے میں اپنے پچھلے کالم کے ذریعہ ایک بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ میں ان دوست کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ویسے بھی میں کہا کرتا ہوں کہ دو خوش مزاج آدمی نجانے جماعت اسلامی میں کیسے شامل ہو گئے۔ ایک تو ان میں سے بہ نفس نفیس جناب مولانا مودودی ہیں اور دوسرے ٹھیٹ پنیڈ داور میرے یار جناب چودھری صفدر علی جنہوں نے بھٹو حکومت کے دوران میری صحافیانہ خدمات کے عوض ایک ذاتی لوکل خبریں پکڑنے والا ٹرانزسٹر تحفۃً اس خبر رساں ایجنسی کو پیش کیا جس میں تا حکم ثانی ملازمت کر رہا ہوں۔

اس تحفہ کو قبول کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ پہلے جماعت اسلامی میری ملازمت سے برخاستگی چاہتی تھی اب تحفہ دے رہی ہے۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا !!!

ابھی ابھی میری طالبعلمانہ زندگی کے ایک قدیمی دوست جناب عنایت حسین کا جیل سے ایک پرزہ ملا جہاں وہ ہیں وہاں حاکمین خان نے پنکھے نہیں لگوائے۔ ۱۱۷ ڈگری درجہ حرارت چل رہا ہے۔ بوریاں اٹھوائی جاتی ہیں اور رسیاں بٹوائی جاتی ہیں۔ یہ حکومت کے اس اعلان کے پہلے کی بات ہے کہ اخباری کارکنوں کو پی یو جے کی مذاکراتی ٹیم کی درخواست پر بہتر کلاس دے دی گئی ہے تو بھائی عنایت اب آپ بی کلاس کی سہولتوں کے مزے لوٹیے۔ یہی تجویز جناب صبیح الدین غوثی کو ہے جنکو میانوالی کے جیل حکام نے متنبہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے بدمعاشی بند نہ کی تو ان کے "بیڑی ڈنڈا" ڈال دیا جائے گا یعنی وہ انتہائی خطرناک مجرم قرار دے دیئے جائیں گے۔ برادرم یہ خطرناکی کا کام چھوڑ دیں لیکن اگر آپ جیل میں اپنا

ٹھکانا بنانا چاہتے ہیں تو پھر اور بات ہے۔ اس کے فائدے بھی ہیں۔

اس قسم کی ایک اطلاع سرخ و سپید ہنستے مسکراتے پاکستان ٹائمز اسلام آباد بیورو کے معاشی معاملات کے ماہر رپورٹر جناب اسلم شیخ نے مجھ تک بھجوائی ہے کہ اخباری کارکنوں سے گندگی صاف کروائی جارہی ہے۔ شیخ صاحب یہ تو ایک اچھا کام ہے۔ آپ حضرات سے گندگی اٹھوائی تو نہیں جارہی۔

یہ تمام خبریں مجھے ایک خبر رساں ایجنسی کے علاقائی سربراہ کی حیثیت سے بھجوائی گئی تھیں اور پاکستان کی وزارت اطلاعات کے پرنسپل انفارمیشن افسر جناب احمد حسن شیخ صاحب کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں اور جس خبر رساں ایجنسی میں میں ملازم ہوں، خبریں دبا رہی ہے۔ واقعی میں نے پی پی آئی سے محترم اسلم شیخ عنایت حسین اور غوری کی بھیجی ہوئی تمام خبریں دبا دیں!!!

آپ نے پی پی آئی کے حوالے سے پاکستان کے کسی اخبار، ریڈیو یا ٹی وی اسٹیشن سے یہ خبریں سنی ہوں تب ہی تو احمد حسن شیخ صاحب کا الزام غلط ثابت ہوگا ٹھیک ہے نا؟

مجھے یاد ہے مسٹر نسیم احمد سیکرٹری اطلاعات کے تخت پر بیٹھے تو لاہور آئے۔ پریس کلب میں مجھے بھی بحیثیت بیورو چیف مدعو کیا گیا وہاں اخبارات پر پابندی کے سلسلے میں نسیم احمد نے سرزنش شروع کی تو میں نے بھی اپنا تعارف کروایا اور ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو وہ آگ بگولا ہوگئے اور کہا کہ انہیں تعجب ہے کہ مجھے پی پی آئی نے لاہور جیسے اہم شہر میں ایسے اہم عہدے پر فائز کیا ہے۔ اسی رات مجھ سے استعفےٰ طلب کیا گیا لیکن اگلے روز جب میں نے نسیم احمد کو یہ پیغام بھجوایا کہ میں صحافی ہوں، لندن میں کسی پاکستانی ڈبل روٹیاں پکانے والوں کی انجمن کا نمائندہ نہیں ہوں۔ ملازمت کے بغیر بھی صحافی رہا ہوں لہٰذا باز آؤ اور زندہ نہ ہو لو۔ دوسرے دن میرا استعفا واپس کروادیا گیا۔

اب پھر گرمی کا موسم ہے نئے نسیم احمدوں نے وزارت اطلاعات کا دھندا اپنے ذمے لیا ہے بھٹو کے ظالمانہ دور کے ریکارڈ توڑ دیئے گئے ہیں مسعود اللہ خاں کو معذوری کے باعث کوڑے نہیں لگائے گئے۔ باقی تینوں کو لگائے جاچکے ہیں۔ اب گرفتاریاں بھی محض چند گھنٹے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں صحافی اور سینکڑوں صحافتی لیڈر اس ملک میں موجود ہیں۔

ڈیڑھ ماہ تک مساوات بند تھا۔ مذاکرات اس بات پر ٹوٹے تھے کہ پی ایف یو جے ایپنک کے نمائندے اخبارات کے خلاف عام عدالتوں سے فیصلہ کرانے کے حق میں تھے۔ انہی عدالتوں سے جنہوں نے سابق وزیر اعظم بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی لیکن اخبارات کے سلسلے میں خبریں قتل سے زیادہ بڑا جرم سمجھی جارہی تھیں۔ اس وقت میرے دوست محمود جعفری امروز میں اور جرنلسٹ کالونی میں مکانات کی تعمیر کی ٹھیکہ داری فرما رہے تھے عباس اطہر کیمپ جیل میں تھے اور سمری ملٹری کورٹ سے ابھی انہیں بے گناہ قرار دے کر رہا نہیں کیا گیا تھا محترم ضیاء الاسلام انصاری مشرق میں محض ادارتی ذمہ داریاں نباہ رہے تھے اور انہیں صحافیوں اور اخباری کارکنوں کے مسئلہ میں اپنا وقت ضائع کرنے کی فرصت نہیں تھی۔

احفاظ الرحمٰن

محمود جعفری برادری کی خیر خواہی میں ٹھیکہ داری پرمٹ ٹال کر، رشید چودھری اور محترم نسیم الحق عثمانی اپنے حجروں سے باہر آ کر رشید صدیقی سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے، عباس اطہر جیل کی گرمیوں اور سختیوں سے اپنے دوستوں ساتھیوں کو بچانے اور ضیاء الاسلام صاحب سب کی سرپرستی کرتے اسی دن نکل آتے جس دن ایکشن کمیٹی کے آدھے درجن ارکان کو راتوں رات گھروں کا محاصرہ کرکے گرفتار کر لیا گیا۔

اخباری کارکنوں کے ان مستقل بہی خواہوں نے ہمدردیوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس خادم سے بھی یہ کہا کہ حسین نقی تم قومی سطح پر افہام و تفہیم کے حامی ہو۔ (روسی سفیر کے ایک بیان کے سلسلے میں میں نے افریشیا میں چھپے ایک مضمون میں یہ تجویز کیا تھا کہ قومی سطح پر افہام و تفہیم کی جائے۔ اور دائیں اور بائیں بازو کے درمیان آزادانہ جمہوری مسابقت کا راستہ اختیار کیا جائے) لہٰذا یہ کار خیر اس تحریک سے کیوں نہ شروع کیا جائے اور اخباری صنعت کے کارکن اپنا جائز حق متفق اتحاد اور اتفاق سے کیوں نہ منوالیں۔

اس جذبہ کو پسند کرتے ہوئے ہم نے بات چیت کی لیکن چند روز ہی میں یہ عقدہ کھل گیا کہ اصل خواہش مسئلہ کا حل نہیں بلکہ احتجاجی بھوک ہڑتال کا یکطرفہ خاتمہ مقصود ہے اور ساتھ ساتھ تحریک شروع کرنے والی قیادت کو لعن طعن کرنا۔ اپنے ہی سو سے زائد ساتھیوں کے جذبۂ قربانی کے اعتراف کے بجائے اسے محاذ آرائی اور سیاسی مقصد گردانا ہے۔

اب سب کھل کر سامنے آگیا ہے۔

کیا اخباری کارکنوں کی موجودہ تحریک اخباری صنعت کے کارکنوں میں داخلی محاذ آرائی کا سبب بنے گی یا متوازی تنظیم سازی کا بہانہ۔ عارضی طور پر جو کچھ بھی ہو قیادت اس کے پاس ہوگی جو جدوجہد کا راستہ اپنائے گا سودے بازی کا نہیں جو دوسرے کے دکھ اور پریشانی کو اپنا دکھ اور پریشانی سمجھے گا۔ ریڈیو سے ناموں کی بیانوں کی تکرار ہم نے پہلے بھی بہت سنی ہے۔ ٹی وی سے ایک ہی چہرے کو برسوں دیکھا ہے۔ اس کے پہلے اور بعد عبرت کے مناظر بھی۔

آپ حضرات کچھ بھی کرلیں پی ایف یو جے اور ایپنک کی منتخب اعلیٰ قیادت نے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ایک فعال اور حوصلہ مند قیادت ہے۔ وہ خود بھی جدوجہد کرتی ہے اور اس کی آواز پر ملک بھر کی اخباری صنعت کے کارکن بھی جو قید بھی کاٹتے ہیں اور کوڑے بھی کھالیتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، قیادتیں نہیں پیدا کرتے کارکن بھی نہیں۔ لیڈروں اور بھگوڑوں میں وہی فرق ہوتا ہے جو پی ایف یو جے کے سیکرٹری جنرل نثار عثمانی اور مولانا نسیم الحق عثمانی میں پایا جاتا ہے یا کوڑے سہہ سکنے والے اقبال جعفری اور پکوڑے کھانے والے محمود جعفری میں۔

ہر قوم، ہر برادری ہر تنظیم میں دونوں متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اخباری صنعت کے کارکن بھی ہماری قوم کا ہی حصہ ہیں۔ بہادر بھی، بزدل بھی، ذاتی مفاد کو قربان کرنے والے بھی اور مفاد پرست بھی۔ زندگی خیر و شر کی انہیں قوتوں اور ان کے درمیان کش مکش سے عبارت ہے۔ یہ کش مکش بڑھ رہی ہے۔ پھیل رہی ہے۔ یہی ہماری قوم میں زندگی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

کچھ سچ کچھ جھوٹ

موت اور زندگی

امر جلیل

میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔ کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ میں نے اسے ویرانوں میں بھٹکتے ہوئے دیکھا ہے مجھے اس کے بارے میں کسی نے بتایا تھا کہ وہ نارسا ہے اور ویرانوں میں آس کے جگنو تلاش کرتا ہے اس شخص میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ ایک روز اس شخص کا میں نے تعاقب کیا۔ وہ بستیاں چھوڑ کر ویرانوں میں نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ایک جگہ اچانک پلٹ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم میرا تعاقب کر رہے ہو۔"

میں جھینپ گیا۔ بوکھلاہٹ میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"نہیں تو۔ میں یونہی یہاں سے گزر رہا تھا۔"

وہ چالیس بیالیس برس کا ایک شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانوں سے زیادہ وحشت تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا دشت کو دیکھ کر تمہیں گھر یاد آتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے دشت پیمائی کا شوق نہیں ہے۔"

"پھر میرے پیچھے مت آؤ۔" میری طرف پشت کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری تنہائیوں میں تم خواہ مخواہ مخل ہو رہے ہو۔"

وہ جنگلوں سے نکل کر صحراؤں کی طرف چلا گیا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ جب میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تب میں بستی کی طرف لوٹ آیا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ وہ ایک گوہر آبدار کی تلاش میں ہے۔

دوسرے روز میں نے پھر اس کا تعاقب کیا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ بوجھل قدموں سے ایک پگڈنڈی سے گزر رہا تھا۔ تاریخی کھنڈروں کی طرف مڑنے سے پہلے اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں سورج کی قندیلیں روشن تھیں۔ اُس نے پوچھا۔ "کیا تم کسی خفیہ محکمے کے ملازم ہو کہ اس طرح میرا تعاقب کر رہے ہو۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تم مل جاتے ہو کسی موڑ پر۔"

اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کل سے ہم کسی موڑ پر نہیں ملیں گے۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ جب بوڑھے برگد کے سائے میں داخل ہوا تو میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا اور اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کون ہے! وہ اس قدر پُراسرار کیوں ہے! اس کی آشفتہ حالی میں وہ کون سی کشش ہے کہ میں اس کے تعاقب میں نکل پڑتا ہوں! میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں مایوس ہو کر بستی کی طرف لوٹ آیا۔ میرا تجسس دیکھ کر کسی نے کہا۔ "وہ غیر ملکی جاسوس ہے اور بہروپیا بن کر اہم معلومات حاصل کر رہا ہے۔"

مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ ایسا تو نہیں لگتا تھا! وہ کوئی بیراگی تھا اور دنیا کی رونقوں اور محفلوں سے اکتا گیا تھا۔ غالباً اس کا دل بجھ گیا تھا۔ اور وہ لطفِ انجمن سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور پھر کئی روز تک وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ جنگلوں، ویرانوں اور بیابانوں میں بھٹکتا رہا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کے کھونے کا مجھے بے حد دکھ پہنچا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اور میرے درمیان کیا رشتہ تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھے اجنبی نہیں لگتا تھا۔ وہ پُراسرار ضرور تھا لیکن الزام تراشیوں سے مبرّا نظر آتا تھا۔ وہ نہ تو تخریب کار لگتا تھا اور نہ غیر ملکی جاسوس۔ وہ مجھے ایک بے حد حسّاس شخص محسوس ہوا تھا۔ ایک حسّاس شخص معاشرے کی ناانصافیوں خباثت اور بدتہذیبی کے خلاف اپنا احتجاج اس طرح بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود کو تمام معاشرے سے کاٹ کر الگ کر دیتا ہے۔ وہ معاشرے کے کسی فعل میں عمل پیرا نہیں ہوتا۔ وہ بستیوں سے منہ موڑ کر ویرانوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہ ان راہوں کو اپناتا ہے جن راہوں کی نشاندہی سچل سرمست اور سلطان باہو نے کی ہے۔ جن راہوں کی نشاندہی شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بُلّھے شاہ نے کی ہے۔ یہ ایک تنہا شخص کی تمام معاشرے کی ظلمتوں کے خلاف انفرادی بغاوت ہے۔ ایک بے انتہا بہادر نڈر اور دلیر شخص دار و رسن کو لبیک کہتا ہے یا معاشرے کو ٹھکرا کر بیراگی بن جاتا ہے لیکن وہ معاشرے کی غلاظتوں اور تاریکیوں سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔

اُس کو کھونے کا دُکھ خارِ مغیلاں کی مانند میری رُوح میں چُبھتا رہا۔ ایک روز میں نے حزن و ملال کی کیفیت میں اسے وحشتوں کی وادیوں سے پکارا۔ میں نے کہا۔ "میں ناسپاس نہیں ہوں۔ میں کالیداس نہیں ہوں۔ میں تیرے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تیرے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ تجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

تب اچانک وہ روشنیوں کی پگڈنڈی سے میری طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں ارض و سما میں تلاش کیا ہے۔ تمہاری تلاش میں میں شب و روز جنگلوں ویرانوں اور کھنڈروں میں بھٹکتا رہا ہوں۔"

"کیوں!" اُس کی آواز میں صدیوں کی بازگشت تھی۔

میں نے کہا۔ "میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

(باقی ص۳۲ پر)

ملک کی موجودہ صورتحال سے کوئی بھی مطمئن نہیں

بی ایس او کے صدر رازق بلوچ کا انٹرویو

وہاب صدیقی

رازق بگٹی بلوچ' بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مرکزی صدر ہیں۔ جواں ہمت اور ترقی پسند نظریات کے حامی، رازق اور اُن کی بی ایس او نے بلوچستان میں جمہوریت کی تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ اس "جرم" کی پاداش میں نہ صرف بی ایس پر حکمرانوں کا عتاب نازل ہوا۔ بلکہ رازق کو حیدرآباد سازش کیس میں بھی ملوث کر دیا گیا اور انہوں نے تقریباً بیس ماہ جیل میں گذارے۔ رہائی کے بعد انہوں نے بی ایس او کا کنونشن منعقد کیا۔ جس میں انہیں مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ ذیل کے انٹرویو میں انہوں نے بی ایس او کے پروگرام' طلبا کے مسائل' ملکی سیاست خصوصاً بلوچستان کی صورتِ حال پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

سوال: قید و بند سے رہائی کے کچھ ہی عرصے بعد آپ نے بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) کا کامیاب کنونشن منعقد کیا۔ کنونشن میں بحث مباحثے کے نتیجے میں ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں آپ کی تنظیم نے کیا تجزیہ کیا اور تجزیے کی روشنی میں عملی اقدامات کا کیا پروگرام مرتب کیا؟

رازق: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک کی موجودہ صورتِ حال سے کوئی بھی مطمئن نہیں۔ کیونکہ جس ملک میں بھی عوام اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تو اُن کا مقصد صرف برسرِ اقتدار گروہوں کو بدلنا نہیں ہوتا اور نہ ہی اُن کی جدوجہد "چہروں کی تبدیلی" کے لئے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ جدوجہد اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کے مسائل کا مداوا ہو' اور ان کے حل کی کوئی واضح صورت سامنے آئے۔ اس وقت ملک میں مارشل لا نافذ ہے۔ اور کوئی بھی باشعور شخص مارشل لا حکام سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ عوام کے مسائل حل کریں گے۔ جب کہ وہ خود بھی عبوری دور کی حد تک برسرِ اقتدار رہنے کی باتیں کرتے ہیں۔ اور کوئی بھی عبوری انتظامیہ طویل المیعاد منصوبوں پر توجہ نہیں دیتی۔ اُس کے پیشِ نظر مختصر مقاصد ہوتے ہیں۔ لیکن جب عبوری دور کی کوئی بھی حکومت مسائل کو مزید الجھائے' اور عوام یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ ماضی کے مقابلے میں زیادہ بدحالی کی طرف جا رہے ہیں اور مسائل بڑھ رہے ہیں۔ تو بے چینی' انتشار اور اضطراب جنم لیتا ہے۔ جب ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ایسے وہ تمام افراد یا جماعتیں جو عوام کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے کے حامی ہوتے ہیں ملکی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس کی روشنی میں عملی پروگرام مرتب کرتے ہیں۔

بی ایس او کے حالیہ کنونشن کا مقصد یہی تھا کہ مسائل اور حالات کے بارے میں تجزیہ کر کے اُن کے ٹھوس حل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے ان قوتوں کو متحد اور یکجا کیا جائے جو حقیقی معنوں میں عوام کی مشکلات کو محسوس کرتی ہیں اور ان کو دور کرنے کے لئے انتہائی ایمانداری سے کچھ اقدامات کرنا چاہتی ہیں ہمارا تعلق ایک طلبا تنظیم سے ہے۔ اس لئے طے کیا گیا کہ پہلے ہم خیال ترقی پسند طلبا تنظیموں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کاوش کی جائے۔ اس سلسلے میں مختلف طلبا تنظیموں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ اور جلد ہی ایسی صورتِ حال سامنے آئے گی جس کے ملکی سیاست پر بھی دُور رس اثرات مرتب ہوں گے۔

بی ایس او نے اپنے کنونشن میں ایک پروگرام مرتب کیا، جس کے خاص نکات یہ ہیں۔

۱: بلوچستان میں اب تک جن زیادتیوں کو روا رکھا گیا اور اسی طرح پورے ملک میں مزدوروں، کسانوں، طلبا' دانشوروں اور دیگر مظلوم طبقات سے جو سلوک برتا گیا ہے۔ ان تمام کا محاسبہ ہونا چاہیئے اور لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اس قسم کی کارروائیاں کیونکر کی گئیں۔

۲: مارشل لا کو فوری طور پر ختم کیا جائے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔

۳: مکمل صوبائی خود مختاری اور قومیتوں کو تسلیم کیا جائے۔ کرنسی، دفاع اور امورِ خارجہ کے علاوہ تمام امور میں صوبوں کو خود مختاری دی جائے۔

۴: غیر فرقہ وارانہ سماج اور لوٹ کھسوٹ سے پاک معاشرہ کے قیام کے لئے جدوجہد کی جائے گی۔

۵: ملک میں تمام ہم خیال طلبا تنظیموں اور سیاسی جماعتوں سے قریبی روابط قائم کئے جائیں گے۔

۶: دنیا میں جہاں کہیں قومی آزادی کی تحریکات چل رہی ہیں' خصوصاً ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں' اُن کی مکمل حمایت کی جائے گی۔

۷: پاکستان غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اپنائے۔ سینٹو اور دیگر سامراجی معاہدوں سے علیحدگی اختیار کی جائے اور عوام دوست قوتوں سے دوستی کی جائے۔

۸: سائنٹفک بنیادوں پر نظامِ تعلیم مرتب کروانے اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنوانے کے لئے بھرپور جدوجہد کی جائے گی۔ تجارتی بنیادوں پر تعلیمی نظام کو چلانے کی مخالفت کی جائے گی۔ مختلف تعلیمی اداروں کی درجہ بندیوں کے خلاف جدوجہد کی جائے گی اور ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ ہر شہری تعلیم حاصل کر سکے۔

سوال: ابھی آپ نے کہا کہ بی ایس او ترقی پسند طلبا تنظیموں کو یکجا کرنے کے لئے مختلف تنظیموں سے رابطہ قائم کر چکی ہے۔ کیا آپ ان تنظیموں کے نام بتانا پسند کریں گے؟

رازق: یہ پہلی کوشش نہیں ہے۔ ماضی میں ہم نے نیشنل یونین آف اسٹوڈنٹس تشکیل دی تھی۔ اس میں چار طلبا جماعتیں، بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور پنجاب اسٹوڈنٹس یونین شامل تھیں۔ یہ تنظیم اب بھی موجود ہے اور اب ہم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن، جیسے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور پنجاب کی تمام ترقی پسند اور انقلابی طلبہ تنظیموں سے رابطہ قائم کئے ہوتے ہیں۔ مذاکرات جاری ہیں۔ اور عنقریب آپ خوشخبری سنیں گے۔

سوال: بی ایس او کے پروگرام میں محاسبے کا مطالبہ بھی شامل ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارشل لا انتظامیہ جو احتسابی کارروائیاں کر رہی ہے آپ اس کے حامی ہیں؟

رازق: محاسبے اور احتساب کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ یکطرفہ ہے۔ حقیقی دشواریوں اور بڑی باتوں کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کا محاسبہ کیا جا رہا ہے لیکن اس امر کا احتساب نہیں کیا جاتا کہ بلوچستان میں فوجی کارروائی کے دوران جو ایک کروڑ روپیہ یومیہ خرچ ہوا۔ اس کا ذمّے دار کون تھا۔ اور نہ ہی اس بات کا محاسبہ ہو رہا ہے کہ وہ کون سے حکمران طبقات تھے' جنہوں نے بلوچستان کے عوام کو تیسرے درجے کا شہری بنانے کی کوشش کی۔ ہم موجودہ احتسابی عمل کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی انتظامیہ کر رہی ہے جو غیر منتخب ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ بھی نہیں' ہم منتخب حکومت کے ذریعے محاسبے کے حامی ہیں۔ یا پھر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل کمیشن کے ذریعے احتساب کیا جائے۔

> **محاسبے کے نام پر یکطرفہ کارروائی ہو رہی ہے!**

سوال: خضدار، تربت اور بلوچستان کے دیگر مقامات پر طلبا پر پولیس نے فائرنگ کیوں کی۔ اور اس کا ذمّے دار کون ہے؟

رازق: خضدار میں بی ایس او کے زونل الیکشن ہوتے۔ انتظامیہ نے اس بہانہ کی آڑ میں کہ "وہاں حکومت کے خلاف تقریریں کی گئیں" پانچ طلبا کو گرفتار کر لیا۔ اس پر طلبا نے احتجاج کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ بلاشبہ تقریریں کی گئی تھیں۔ طلبا کے مسائل کے بارے میں حکام نے جو سرد مہری اختیار کی ہوئی ہے، اُس پر تنقید بھی کی گئی تھی۔ اور یہ کوئی جرم نہیں، کیونکہ جنرل ضیاالحق خود کہہ چکے ہیں کہ حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید کی جائے لیکن شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار نوکر شاہی نے اس تنقید کو "جرم" گردانا۔ طلبا نے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لئے پُرامن جلوس بھی نکالا لیکن انتظامیہ نے اس پُرامن جلوس پر فائرنگ کروا دی۔ تربت کا واقعہ یہ ہے کہ دو افراد موٹر سائیکل پر جا رہے تھے کہ کوسٹ گارڈ نے ان پر فائرنگ کر دی۔ اس وجہ سے طلبا اور عوام میں بے چینی پیدا ہوئی۔ انہوں نے احتجاج کیا۔ تو پہلے پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور پھر فائرنگ شروع کر دی۔ جس کافی افراد زخمی ہوئے۔ انتظامیہ نے خضدار کے المیہ کے بارے میں انکوائری کا ڈھونگ رچایا۔ جو بعد میں سرد خانے میں ڈال دی گئی۔ ویسے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں' پاکستان میں آج تک کسی تحقیقات کی رپورٹ عوام کے سامنے پیش نہیں کی گئی۔ تحقیقات کا ڈرامہ تو عوام کے جذبات سرد کرنے کے لئے کھیلا جاتا ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ واقعہ میں ملوث افراد اپنی انکوائری کس طرح کر سکتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتظامیہ نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا؟ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ بی ایس او نے ہمیشہ ہر حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید اور مخالفت کی ہے۔ کیونکہ ہمارا موقف ہے کہ عوام کو حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ بی ایس او آج بھی اسی موقف پر قائم ہے اور اس پر عمل پیرا ہے۔ بی ایس او کے اس موقف سے حکمران اختلاف رکھتے ہیں۔ اور اس رجحان کو ختم کرنے کے لئے تشدد کا سہارا لیتے ہیں۔

سوال: لیکن بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ آپ کی تنظیم انتہا پسند ہے۔ اور وہ بلوچستان کے حالات کو معمول پر لانے کی کوششوں کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہے۔ حال ہی میں جماعت اسلامی کے ایک ترجمان جریدے نے الزام لگایا ہے کہ بی ایس او' اکبر بگٹی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے اور گائیڈ لائن اور سرمایہ اکبر بگٹی سے لیتی ہے۔ ان الزامات کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

رازق: بلوچستان کے "حالات کو معمول پر لانے" کا فلسفہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر "حالات کو

> **بکاؤ لوگوں کو بھی اپنے جیسے نظر آتے ہیں**

کابل کی حالیہ سیاسی تبدیلی ایک مثبت تبدیلی ہے

معمول پر لانا" اس کو کہتے ہیں کہ چند سر کردہ لوگوں کو رہا کر کے اپنی حمایت میں ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا عوام کے حقوق کی آواز بلند کرنے سے روکا جاتا ہے تو اس قسم کے "حالات معمول پر لانے" کا تصور حکومت یا اُس کے حمایتی ہی کرسکتے ہیں لیکن وہ لوگ لازمی طور پر اس کا تصور نہیں کرسکتے، جنہوں نے ظلم اور زیادتی کے خلاف ہمیشہ جدوجہد کی ہے۔ اب بھی لاتعداد عام لوگ سیاسی کارکن جیلوں میں بند ہیں۔ فوجی کیمپوں میں ہیں۔ اور اب بلوچستان میں حالات معمول پر لانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ حالات ویسے ہی ہیں "حالات کو معمول پر لانے" والے اقدامات صرف بیانات اور زبانی جمع خرچ تک محدود رہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا۔ مثلاً ہمارا مطالبہ تھا کہ بلوچستان میں فوجیں ۱۹۷۲ء کی پوزیشن پر لائی جائیں۔ اُس وقت صرف کوئٹہ میں ہی چھاؤنی تھی لیکن آج فوجیں دور دراز کے علاقوں میں بھی موجود ہیں کیونکہ وہاں چھاؤنیاں بنادی گئی ہیں۔ اب اگر ہم یہ بات کرتے ہیں کہ ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اس صورت حال کو عوام کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ تو ہمارے مخالفین اور آمریت کے پرستار اسے "انتہا پسندی" کا نام دیتے ہیں۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ اکبر بگٹی، بی ایس او کو گائیڈ لائن اور سرمایہ دیتے ہیں' کا تعلق ہے۔ تو شاید الزام لگانے والے بھول جاتے ہیں کہ یہ بی ایس او ہی تھی جس نے سب سے پہلے اکبر بگٹی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ اور احتجاجی جلوس نکالا جس پر بگٹی کے آدمیوں نے فائرنگ کی تھی۔ اور چھ طلبا زخمی ہوئے تھے۔ اور پھر جب نواب خیر بخش کی نشست پر ضمنی انتخاب ہوا۔ تو کالعدم نیپ نے اکبر بگٹی کے بیٹے سلیم بگٹی کی حمایت کی۔ جبکہ بی ایس او نے اُس کی بھرپور مخالفت کی اور اپنے اُن ارکان کو تنظیم سے خارج کردیا جنہوں نے سلیم بگٹی کے لئے کام کیا تھا جب اکبر بگٹی نے گورنری سے استعفیٰ دیا اور اپنی مظلومیت کی داستانیں لوگوں کو سنائیں تو بعض لوگوں کے دلوں میں اُس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوگیا تب بھی بی ایس او نے اپنے موقف میں ذرا بھر تبدیلی نہ کی اور آج بھی اسی موقف پر قائم ہے۔ بی ایس او کے کنونشن کے بعد بعض عناصر نے الزام لگایا کہ کنونشن کے لئے ہم نے قومی محاذ آزادی کے سربراہ معراج محمد خان سے ۴۰ ہزار روپے لئے تھے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی معراج صاحب ۴۰ ہزار روپے دیتے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے، اسی طرح جب خضدار کے المیہ کے بعد بی ایس او نے طلبا برادری کے ساتھ مل کر جو کامیاب احتجاج کیا۔ اور پورے ملک کی ترقی پسند تنظیموں نے ہمارا ساتھ دیا تو پی این اے اور اُس کی ذیلی طلبا تنظیموں کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ احتجاج کے لئے بی ایس او کو پیپلز پارٹی نے سات لاکھ روپے دیئے تھے۔ ان الزامات کے جواب میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ خود بکنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اور ہر تنظیم کو خریدا جاسکتا ہے۔ اُس کی قیمت لگائی جاسکتی ہے۔ ان الزامات کی بوچھاڑ کا مقصد یہ ہے کہ بی ایس او یا تو مصلحت پسندی کا راستہ اختیار کرے۔ یا پھر الزامات کا جواب دیتی رہے۔ ہم اس مکروہ پراپیگنڈے اور الزامات کی سخت مذمت کرتے ہیں۔

سوال: بلوچستان میں طلبا کو کن مسائل کا سامنا ہے اور اُن کے حل کے لئے آپ کی تنظیم کیا کررہی ہے؟

رازق: حکومت یہ تاثر دیتی ہے کہ گذشتہ پانچ برسوں میں بلوچستان میں تعلیمی اداروں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں کالج قائم کئے گئے ہیں لیکن وہاں نہ کتب خانہ اور نہ تجربہ گاہیں' اساتذہ کی سخت کمی ہے اور ایک کالج میں اوسطاً دو، تین اساتذہ مقرر کئے گئے ہیں۔ ان حالات میں طلبا کیسے تعلیم حاصل کریں۔ اسی وجہ سے عموماً وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تعلیمی حکام اور بیوروکریسی اپنے مفادات کے پیش نظر بلوچستان سے جہالت دور نہیں کرنا چاہتے۔ اس مرتبہ بلوچستان میں انٹرسائنس کا رزلٹ ۱۹ فیصد تھا اس صوبے میں زیادہ سے زیادہ ۲۲ فیصد تک رزلٹ برآمد کیا گیا۔ بلوچستان کے مقابلے میں پنجاب میں رزلٹ ۶۰ فیصد تک رہا ہے۔ بلوچستان میں صرف ایک میڈیکل کالج ہے جس میں ایران، سعودی عرب آزاد کشمیر کے لئے اور دیگر خصوصی نشستیں مخصوص ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بلوچستان کے مستحق طلبا داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے بی ایس او کا مطالبہ ہے کہ دیگر صوبوں کے میڈیکل کالجوں میں بھی بلوچستان کے لئے نشستیں مقرر کی جائیں۔ جیسا کہ دوسرے صوبوں کی نشستیں بولان میڈیکل کالج میں مخصوص کی گئی ہیں۔ بلوچستان کے مستحق طلبا کو میڈیکل کالج اور دیگر فنی کالجوں میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ بھاری پیمانے پر جعلی ڈومیسائل کا اجرا بھی ہے۔ ڈومیسائل سرٹیفکیٹ ڈپٹی کمشنر جاری کردیتے ہیں جعلی ڈومیسائلوں پر طلبا اعتراض کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ آپ ثابت کریں اور ثبوت دینے کے لئے صرف چار دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اب اگر کسی طالب علم نے مکران کا ڈومیسائل دیا ہے تو اعتراض کنندہ کو خود مکران جانا پڑے گا۔ کوئٹہ سے مکران آنے جانے میں ہی ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔ بھلا وہ چار دن میں ثبوت کہاں سے لے آئے گا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ اعتراض کے بعد ڈومیسائل کے جعلی یا حقیقی ہونے کی تحقیقات خود حکومت کرے۔

ہماری کوشش ہے کہ کالجوں میں کتب خانے اور تجربہ گاہیں قائم کروائے۔ اور دیہی علاقوں میں اسکول قائم کروائے تاکہ عام آدمی بھی تعلیم حاصل کرسکے۔

سوال: چند ماہ قبل اسلام آباد میں تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی۔ جسے قومی تعلیمی کانفرنس کا نام دیا گیا۔ اس کانفرنس اور اس کی سفارشات کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

رازق: تعلیم کا تعلق براہ راست طلبا سے ہوتا ہے۔ اور طلبا مختلف تنظیموں میں منقسم ہیں۔ اور یہ تنظیمیں مختلف نظریات اور خیالات رکھتی ہیں۔ یہ سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی تعلیمی کانفرنس میں تمام طلبا تنظیموں کو مدعو نہیں کیا گیا۔ صرف ایسے لوگوں کو بلایا گیا جن کو جی حضوری کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا اسی لئے یہ تعلیمی کانفرنس سے زیادہ بریفنگ کا اجلاس معلوم ہوتی تھی۔ جہاں پہلے سے طے شدہ پروگرام پر جی حضوریوں سے "منظوری" لے لی گئی۔ اس کانفرنس میں نام نہاد ماہرین نے سائنسی بنیادوں پر پروگرام مرتب کرنے کی بجائے فرقہ وارانہ باتیں کیں اس لئے اسے قومی کانفرنس کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

تعلیم ایک سماجی مسئلہ ہے اور سماجی مسائل کو حل کرتے وقت عوامی خواہشات اور سائنسی لوازمات کو مدنظر نہ رکھا جائے۔ تو مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ برسراقتدار لوگ ہمیشہ سابق حکومتوں پر الزامات لگاتے ہیں کہ انہوں نے عوام کی خواہشات کو نظرانداز کیا اور یک طرفہ طور پر فیصلے کئے لیکن وہ خود بھی جب کوئی اقدام کرتے ہیں وہ عوامی خواہشات کے برعکس اور یک طرفہ ہی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہمارے حکمران ماضی سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے، اور جب ماضی کے تجربے کو نظرانداز کیا جائے تو اس کا نتیجہ عوام کی بے چینی اور اضطراب کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اور بے چینی کا انجام کسی سے پوشیدہ نہیں۔

سوال: ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال آپ کی نظر میں بحران کا شکار ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس سے نکلنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں؟

رازق: اس وقت ملک یقینی طور پر بحران کا شکار ہے لیکن بحران پر قابو پانے کی حکمران طبقات کوششیں نہیں کر رہے ہیں ہمارے ہاں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بلی کے آنے یا اُس کے حملے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور یہ روایت بہت عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ ہر چار، پانچ سال کے بعد ملک بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پاکستان میں ہمیشہ سیاست کو دو پہلوؤں پر آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک کی صورتِ حال کا تجزیہ کیا جائے۔ تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مخصوص گروہی مفادات کے تحت عوام کے مسائل کو حل کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ہمیشہ انہیں نظر انداز کیا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹوٹی پھوٹی سول حکومت لولی لنگڑی جمہوریت کے ساتھ عوام کو سبز باغ دکھاتی ہے جب عوام یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کی مشکلات اور مصائب میں کوئی کمی نہیں آتی اور وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے جدوجہد شروع کر دیتے ہیں۔ تو پھر ایک "سگنل" کے ذریعے سول حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے اور فوجی حکومت قائم کر دی جاتی ہے۔ یہ ملک میں تیسرا مارشل لا ہے۔ بالفاظ دیگر تین مرتبہ سول حکومتیں ناکام ہوئیں۔ دو مرتبہ فوجی حکومتیں اور تیسرے مارشل لا سے بھی مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی حالات کو درست کرنے، عوام کو خوشحال بنانے اور اُن کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ان مخصوص مفادات رکھنے والے گروہوں کے بس کی بات نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک میں ایسی کوئی تیسری حقیقی عوامی قوت موجود نہیں جو ملک اور قوم کو اس بحران سے نکال کر ایسے راستے پر ڈالے جو خوشحالی کی منزل کی طرف جاتا ہو۔ موجودہ صورتِ حال میں جمہوریت نواز، عوام دوست اور ترقی پسند طاقتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور اپنی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کر کے ملک اور عوام کو بحران اور مصائب سے نجات دلائیں۔

سوال: اب تک جو لوگ بلوچستان میں سیاسی قیادت کہلاتے رہے ہیں کیا وہ عصری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں اگر نہیں تو متبادل قیادت کیسے وجود میں آئے گی اور اس کا پروگرام کیا ہونا چاہیئے؟

رازق: عوام خواہ کسی ملک کے ہوں، ان کا تعلق خواہ کسی صوبے سے ہو، وہ ایسی قیادت پسند کرتے ہیں جو انہیں مصائب سے نجات دلائے۔ ان کے بنیادی اور قومی حقوق کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ بلوچستان کی مخصوص صورتِ حال سے یہ بات اور بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں نے ملک میں جمہوریت کے نفاذ، ظلم و جبر کے خاتمے اور قومی حقوق کے لئے بھرپور جدوجہد کی ہے، اپنی جانوں کا نذرانہ پیش

تھرپارکر

ہسپتال میں ادویات کی قلت اور ڈاکٹروں کی دھاندلی

—— عبدالمنان خان قائم خانی ——

ضلع تھرپارکر کی دس لاکھ آبادی کے لئے طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر میرپور خاص میں ایک سول ہسپتال اور تعلقوں کی سطح پر چھوٹے ہسپتال قائم ہیں تربیت یافتہ میڈیکل گریجویٹس دورافتادہ علاقوں کا رخ نہیں کرتے جس کی وجہ سے غیر تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی بھرمار ہے۔ یہ ناتجربہ کار نام نہاد ڈاکٹر، میڈیکل اسٹوروں پر سال بھر کام کرنے کے بعد "کِلنک" سمیت لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں، مرض کی تشخیص کو خاطر میں نہ لاتے ہوتے ان کے نزدیک کار اور بنگلوں کے حصول کے لئے دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور یہ نیم حکیم خطرہ جان بن جاتے ہیں

اس سے ہٹ کر سرکاری ہسپتالوں کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہے۔ ضلع کے بڑے طبی مرکز "سول ہسپتال" میرپور میں داخل ہوتے ہی گمان گزرتا ہے کہ آپ کو گندگی کے ڈھیر میں اٹھا کر پھینک دیا ہو ضلع کی دس لاکھ آبادی کے لئے واحد "سرجن" کا قیام اس گند خانے میں ہے یہاں پر لوٹ مار کا کام ذرا وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔ اور مختلف طریقوں سے یعنی ہزاروں روپوں کے عوض غلط رپورٹ پر مبنی میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ ادویات کا بڑا حصہ ناجائز طور پر میڈیکل اسٹوروں پر فروخت کر دیا جاتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ کمپاونڈروں کی سالانہ بھرتی کے موقع پر رشوت لیکر حقدار امیدواروں کو داخلے سے محروم کر دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ تھرڈ کلاس میٹرک پاس طلباء سے پوری کی جاتی ہے۔ یہی کچھ حال تعلقہ سطح پر قائم ہسپتالوں کا ہے ہر ہسپتال تین افراد کے مختصر عملے پر مشتمل ہے جس میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر، ایک کمپاونڈر اور ایک ڈریسر ہوتا ہے۔ ان ہسپتالوں میں بھی میڈیکل سرٹیفکیٹوں کے عوض بھاری رشوت وصول کی جاتی ہے گزشتہ دو ماہ کے عرصے میں ان ہسپتالوں کے بارے میں چند واقعات منظرِ عام پر آئے۔ عمر کوٹ کے میڈیکل آفیسر محمد ہاشم میمن کو اشیائے صرف کی چیکنگ کے دوران رشوت لینے کے الزام میں عوام کی شکایت پر برطرف کر دیا گیا لیکن ایک ہفتے بعد دوبارہ بحال کر دیا گیا اسی دوران جمیس آباد کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر کرشن لال کو چار سو روپے رشوت لیتے رنگوں ہاتھوں گرفتار کیا گیا اور ایک ماہ محکمہ "انٹی کرپشن" کی تحویل میں رہنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

ضلع کے ریگستانی علاقے "تھر" کے عوام کو ایکسرے کے حصول کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے جو کہ سفری سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے بے حد مشکل اور پریشان کن ہے۔ حکومت کو واضح "صحت پالیسی" مرتب کرنی چاہیئے تاکہ پسماندہ علاقوں کے عوام بنیادی طبی سہولتوں سے مستفیض ہو سکیں۔ اس کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ نام نہاد ڈاکٹروں پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے اور تجربہ کار میڈیکل گریجویٹس کو دیہات میں خدمات انجام دینے کے لئے بہتر مواقع فراہم کئے جائیں۔ ساتھ ہی مناسب ادویات کی بروقت فراہمی اور دور دراز علاقوں میں طبی مراکز کے قیام سمیت عوام کی مشکلات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ورنہ ممکن نظر نہیں آتا کہ "انسانی" جانوں سے کھیلنے کا یہ عجیب و غریب کھیل بند ہو سکے گا۔

کیا ہے۔ اس جدوجہد کا مقصد یہ رہا کہ بلوچستان کے عوام کو اس ملک کے تیسرے درجے کا شہری سمجھنے کی بجائے برابری کی حیثیت دی جائے۔ اس جدوجہد کے دوران جن لوگوں نے عوامی خواہشات کو نظر انداز کیا اور تحریک کا ساتھ نہ دیا اُن کے بارے میں بلوچستان کے عوام اچھی رائے نہیں رکھتے اور نہ ہی اُن کے لئے اپنے دلوں میں کوئی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ لیکن جن قائدین نے عوامی خواہشات کے مطابق واضح پروگرام مرتب کیا اور آگے بڑھے عوام نے اُن کا خیرمقدم کیا۔ اور اُن پر جانیں نچھاور کیں۔ چنانچہ موجودہ صورتِ حال میں یا آئندہ اگر کوئی لیڈر عوام کے بنیادی مفادات یا ان کی خواہشات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے گا تو بلوچستان کے عوام ہرگز اُس کی حمایت نہیں کریں گے۔ کالعدم نیپ کی مثال آپ کے سامنے ہے کہ جو حمایت اُسے اپنے پروگرام کی بنا پر بلوچستان سے حاصل ہوئی۔ وہ حمایت این ڈی پی حاصل نہیں کر سکی کیونکہ این ڈی پی کا پروگرام عوامی خواہشات کے مطابق نہیں۔ الغرض جو قائد عوام کے حقوق کو نظر انداز کرے گا۔ وہ اپنی مقبولیت کھو بیٹھے گا۔ خواہ سماجی طور پر اُس کی حیثیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ جہاں تک بی ایس او کا تعلق ہے۔ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق ایک پروگرام پیش کیا ہے۔ اور ہم اس پروگرام سے کسی بھی صورت میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

سوال: افغانستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ کے خیال میں پاکستان اور خصوصاً بلوچستان اور سرحد میں انقلاب کابل کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟

رازق: کابل کی حالیہ سیاسی تبدیلی ایک مثبت تبدیلی ہے۔ اور مثبت تبدیلی کے اثرات بھی مثبت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو عوامی حقوق، اقتدار عوام کے حوالے کئے جانے اور قومی حقوق کے لئے مصروفِ جہد ہیں۔ انہیں اس مثبت تبدیلی اور اس کے اثرات کا اندازہ بخوبی ہوگا افغانستان کی موجودہ حکومت نے قومیتوں کے مسئلے کو حل کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ تمام قومیتوں کو حکومت میں شامل کیا گیا ہے افغانستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے پروگرام ریڈیو سے نشر کئے جا رہے ہیں۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بات بھی کی گئی ہے۔ ان اقدامات سے پاکستان کی مظلوم قومیتوں کو تقویت ملی ہے۔ اُن کی ڈھارس بندھی ہے اور وہ اسے ایک اچھی علامت سمجھتی ہیں۔ تره کی حکومت کے ان اقدامات سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ قومیتوں کا مسئلہ انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ اور اگر اسے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اتنا پیچیدہ عمل نہیں جس طرح کا پروپیگنڈہ ہمارے ملک میں کیا جاتا ہے۔ ایک اور بات بھی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ قومیتوں کو تسلیم کرنے اور ان کو قومی حقوق دینے سے نہ تو ملک کی سالمیت خطرے میں پڑتی ہے اور نہ حکومت کمزور ہوتی ہے بلکہ حکومت مستحکم ہوتی ہے۔ ملک مضبوط ہوتا ہے۔

اگر تره کی حکومت، افغانستان میں قومیتوں کا مسئلہ حل نہ کرتی اور تمام قومیتوں کو اقتدار میں شامل نہیں کیا جاتا۔ تو شاید وہ اتنی جلد حالات پر قابو نہ پا سکتی۔ ردِ انقلاب کا بھی خدشہ ہر وقت منڈلاتا رہتا کیونکہ نادر شاہی خاندان کی جڑیں بہت مضبوط اور پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن تره کی نے قومی مسئلہ حل کر کے تمام قومیتوں کا تعاون حاصل کر لیا۔ اور نادر شاہی خاندان اور اس کے وفادار جنرل بھی تره کی حکومت کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

بقیہ
کچھ سچ کچھ جھوٹ

اُس نے دُور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں تم جنگلوں میں آس کے جگنو تلاش کرتے ہو۔ کیا یہ درست ہے۔"

"امیدوں سے دامن چھڑانے والے آس کے جگنو تلاش نہیں کرتے۔" اس نے کہا۔ "آرزوؤں کی شمعیں بجھ جانے کے بعد ہم آس کے جگنو تلاش نہیں کرتے۔"

میں نے کہا۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم کسی گوہر آبدار کی تلاش میں ہو۔"

"محفلوں رونقوں اور آسائشوں سے منہ موڑنے کے بعد گوہر آبدار کی تلاش ظاہر میں نہیں بلکہ باطن میں اپنے وجود میں ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے میرا گوہر آبدار مل گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "جب معاشرہ جفاکاری پر اتر آئے تب کیا کرنا چاہئے۔"

اُس نے کہا۔ "ایسے معاشرے سے سمجھوتا کرنے سے مکمل انکار۔"

میں نے کہا۔ "رُوح اور جسم کے مابین رشتے کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

اُس نے کہا۔ "روح کی اذیتیں جسم کو فنا کر دیتی ہیں۔ جسمانی اذیتیں رُوح کو فنا نہیں کر سکتیں۔"

میں نے پوچھا۔ "موت کیا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "نفس کے غلبے کو ہم موت کہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اور زندگی؟"

اُس نے کہا۔ "نفسانی خواہشوں ہوس لالچ اور طمع سے نجات کا نام زندگی ہے۔"

اچانک وہ پلٹا اور روشنیوں کی پگڈنڈی سے واپس چلا گیا۔

سیاسیات کی جدید اصطلاحات میں ان دنوں "مداخلت" کا بڑا چرچا ہے اور یہ اصطلاح خوب فروغ پا رہی ہے طریقۂ استعمال یہ ہے کہ جیسے "استحصال"، "ملک دشمن"، "غیر ملکی ایجنٹ"، "بدعنوان" وغیرہ وغیرہ دوسروں کے لئے وقف ہیں، اسی طرح "مداخلت" کی اصطلاح بھی صرف اور صرف غیر کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور جب خود کی جاتی ہے تو قومی فریضہ، انسان نوازی اور اخلاقی اقدار کی نگہبانی کہلاتی ہے ۔

اسی لئے ملک کے ایک بزرگ تر اور ایک بزرگ نے کویت میں ایک جریدے پر پابندی کے سلسلے میں امیر کویت کو خط لکھا ہے کہ وہ اس جریدے پر سے پابندی اٹھالیں ۔ ظاہر ہے کہ اصطلاح کی ترکیب استعمال کی رو سے اگر کوئی ملک اس قسم کا مطالبہ حکومت پاکستان سے کرے گا تو حکومت کو مشورہ دیا جائے گا کہ یہ بیرونی مداخلت ہے ۔ حکایت —

کسی نے ایک مرد پیر سے پوچھا کہ اے بزرگ! بتا کہ سیاسی اصطلاح میں بھگوڑا کسے کہتے ہیں اور اس کی مثال دے کر سمجھا ۔ بزرگ باراں دیدہ نے جواب دیا کہ اے پسر! اگر کوئی نابہنجار تیری پارٹی چھوڑ کر کسی دوسری پارٹی میں شامل ہو جائے تو وہ بھگوڑا کہلائے گا ۔ ویسے اگر کوئی اپنی پارٹی چھوڑ کر تیری پارٹی میں شامل ہونے کی سعادت پائے تو اسے صبح کا بھولا کہیں گے جو شام کو گھر لوٹ آتا ہے ۔

***

راقم الحروف جس بستی میں رہتا ہے وہاں کتوں کے رات بھر بھونکنے کا ریکارڈ قائم تھا جو اب چند دنوں سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے ۔ اب اکا دکا کتے ہی رات کے کسی حصے میں اچانک بھونک اٹھتے ہیں ۔ اس حیرت ناک تبدیلی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ایڈمنسٹریٹر بلدیہ نے اپنے محکمہ صحت کو ۱۵ مئی کو ہدایات جاری کی تھیں کہ پندرہ روز کے اندر شہر کراچی کے تمام آوارہ کتوں کو ختم کر دیا جائے ۔

راقم الحروف نے مختلف آبادیوں کے لوگوں سے پوچھا کہ ان علاقوں میں گزشتہ ہفتہ عشرہ میں کتنے آوارہ کتوں کا قلع قمع کر دیا گیا تو پتہ چلا کہ کسی علاقے میں بھی کوئی کتا مار رائفل، چھری یا پتھر لے کر نہیں پہنچا ۔ اس کے باوجود آوارہ کتوں کی نفری گھٹ گئی ہے ۔ استعجاب و استفسار پر ایک ذہین آدمی نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ کتوں کی ذہانت اور انٹیلی جنس سروس بہت ہوتی ہے چنانچہ جوں ہی انہوں نے بھانپ لیا کہ حالات خطرناک ہیں اور ان کی جان خطرے میں ہے تو انہوں نے مشترکہ طور پر راہگیروں اور انفرادی طور پر ایک دوسرے پر بھونکنا موقوف کر دیا ۔ اس احتیاطی منصوبہ بندی سے لوگوں نے سمجھا کہ آوارہ کتوں سے نجات مل گئی ہے اور اس طرح بلدیہ کے محکمہ صحت کے اہلکار ایک ناپسندیدہ کام سے بھی بچ گئے اور ان کی کارکردگی بھی شمار میں آگئی ۔ اس بات سے سبق ملتا ہے کہ کورس سونگ اور سنگل سونگ بڑے فائدہ مند فن ہیں ۔

***

اسی تاریخ یعنی ۱۵ مئی کو ناظم آباد کراچی کے صف اول کے ایک اسکول میں کوڑے کے ڈھیر اور گٹر ابلنے کی شکایت کی گئی جس سے سارے علاقے میں تعفن پھیل گیا یعنی انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے بتایا کہ اس سمت چار اسکولوں کے لئے کے ایم سی نے ایک جمعدار مقرر کیا ہے اور وہ بھی دو روز سے غائب تھا ۔ اسے کے ایم سی نے پندرہ دن کی رخصت دے دی تھی ۔

شبہ ہوتا ہے کہ بلدیہ کی طرف سے پندرہ دن کے اندر آوارہ کتوں کو ختم کرنے کی مہم کا مذکورہ جمعدار کی پندرہ دن کی چھٹی سے تعلق ضرور رہا ہوگا کیونکہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے بلدیہ کا عملہ یقیناً ناکافی ہوگا ۔ مزید برآں اس کام کو جمعدار بخیر و خوبی انجام دے سکتے ہیں کہ سڑکوں پر پڑے ہوئے کتوں اور دوسرے جانوروں کو اٹھانا ان ہی کی ذمہ داری ہے اور وہ بقول غالب

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

ان کی لاشوں کو گھسیٹتے ہوئے عموماً دکھائی دیتے ہیں کہتے ہیں کہ پہلے جلاد سر مہتر بھی ہوا کرتے تھے اور ..... بھی ۔ لہٰذا اگر جمعدار صاحبان اپنے مقررہ فرائض کی جگہوں سے غائب پائے جائیں تو تردد کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔ ہو سکتا ہے ان سے کوئی زیادہ اہم کام لیا جا رہا ہو جس کی تفصیل ذرائع ابلاغ تک نہ پہنچتی ہو اس کے علاوہ سرکاری افسر اور عملہ کبھی کبھی دفتری اوقات میں بھی پارٹ ٹائم کام کرتا ہے ۔ اور نالیوں وغیرہ کی صفائی کی ڈیوٹی میں کتے مارے جا سکتے ہیں اور دوسرے ناپسندیدہ جانور بھی

***

کراچی کے ایک موقر روزنامے نے ایک کارٹون چھاپا ہے جس میں ایک بوڑھا شیر دکھایا گیا ہے اور اس کی دم پکڑ کر اٹھائے کھڑا بوڑھا رنگ ماسٹر بھی ۔ کارٹون کے نیچے جو کیپشن ہے وہ سیاست کی ذیل میں آتا ہے لہٰذا اس پر قلم نہیں چلایا جا سکتا، البتہ بوڑھے شیر اور بوڑھے رنگ ماسٹر کے بارے میں متعدد جملے کہے اور چند لکھے جا سکتے ہیں ۔

بوڑھے شیر کے لئے جس شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ درحقیقت ناخنوں اور دانتوں سے محروم ایک سیاسی بوڑھے شیر کی ہے، ہر چند کہ اس ضمن میں وہ لطیفہ بھی ہے جو بارہا پڑھا اور سنا گیا ہے کہ ایک سرکس کا شیر مر گیا تو سرکس والوں نے ایک آدمی کو شیر کی کھال پہنا کر پنجرے میں چھوڑ دیا وغیرہ وغیرہ ۔

البتہ رنگ ماسٹر کے لئے جس مقتدر شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ محل نظر ہے کیونکہ رنگ ماسٹر شیر کا ماسٹر ہوتا ہے لیکن سرکس والوں کا ملازم ہی ہوتا ہے روزی کمانے کے لئے ان کے احکامات کے تحت شیر سے کام لیتا ہے ۔ قطع نظر اس خطرے کے کہ شیر آخر شیر ہے انسان تو نہیں کہ صدا منتر کے اشارے پر حکم کی تعمیل کرے ۔ اگر کبھی بگڑا کھڑا ہوا تو پرخچے اڑا کر رکھ دے گا ۔ اس لئے رنگ ماسٹر کے لئے شخصیت کا انتخاب کچھ زیادہ سوچ سمجھ کر نہیں کیا گیا ***

جب کراچی سنٹرل جیل میں یوم حیدر بخش جتوئی منایا گیا

محمد فصیح

۱۸ مئی کو کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا یوم پیدائش منانے کا پروگرام بنایا گیا۔ لال جھنڈے کا انتظام کیا گیا۔ جھنڈے کے لئے ڈنڈا نہ ملا تو نیم کی لکڑی توڑی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ شام کو بند ہونے کے بعد یوم کامریڈ حیدر بخش جتوئی منایا جائے۔ ہمارے وارڈ نمبر ۳ اے بڑے بیرک میں ہم گیارہ افراد اسیران یوم مئی کے تھے اور پیپلز پارٹی کے سردار حنیف ہمارے ساتھ بند تھے۔ اس طرح ہم بارہ افراد نے کراچی سنٹرل جیل میں یوم کامریڈ حیدر بخش جتوئی منایا۔ جلسے کی صدارت بابو لال نے کی اور اسٹیج سیکریٹری کے فرائض سلیم بلوچ نے انجام دیئے۔

جناب جاوید شکور نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے ۱۹۴۰ء میں کلکٹری کی عیاشی چھوڑ کر غریب کسانوں میں کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت روس میں انقلاب تو آچکا تھا مگر سوشلسٹ کیمپ وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے مقابلے میں سامراج کے شباب کا دور تھا جب کہ آج وہ بین الاقوامی تحریک جس کے لئے کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی وہ سب جگہ کامیاب ہو رہی ہے۔ پاکستان کی سرحدوں پر خوشحالی کے گیت گاتے جا رہے ہیں اور پاکستان کے مزدور، طلبا، کسان، صحافی اور اساتذہ بڑی بہادری کے ساتھ جبر کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور حکمران طبقات اور اس کے ساتھ دوسری رجعت پسند پارٹیاں بھی ننگی ہو گئی ہیں اب عوام بہت باشعور ہو چکے ہیں وہ قومی اتحاد اور حکمرانوں سب کے مکروفریب کو پہچانتے ہیں اور وہ دھوکہ میں نہیں آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ قومی حکومت مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ مزدور، طلبا، کسان اور دوسرے محب وطن سامراج دشمن طبقات کو حکومت ملنی چاہیئے اور وہ ہی فعال انتخابات ملک میں کرائیں گے۔

جناب سلیم صالح بلوچ نے کہا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور برطانوی دور میں کلکٹر تھے۔ وہ کسانوں اور مزدوروں پر ظلم دیکھ کر بہت متاثر ہوتے اور انہوں نے خود غرضی کی راہ چھوڑ کر کسانوں کی خدمت اور ان کو منظم کرنا اور شعور دینا اپنا مسلک بنایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ حیدر بخش جتوئی کے نظریات کا دور ہے۔ جو شمع انہوں نے روشن کی تھی آج کسان اسی روشنی کو سینے سے لگائے ہوتے ہیں اور پٹ فیڈر، ڈیہہ مبارک، ہشت نگر اور خضدار میں جو ظلم ہوا اور جس طرح کسانوں، مزدوروں اور طلبا نے ان کا مقابلہ کیا اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ امن آزادی اور خوشحالی پاکستان کی مغربی سرحد پر پہنچ چکی ہے اور وہ دن دور نہیں جب کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا مشن پاکستان میں بھی کامیاب ہوگا۔

جناب محمد فصیح نے کہا کہ حیدر بخش جتوئی برطانوی سامراج کی ریاستی مشنری کے ایک پرزے تھے اور وہ کلکٹری کے بڑے عہدے پر فائز تھے جب انہوں نے مارکس، اینجلز اور لینن کو پڑھا تو ان کے دل میں نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ان کے اپنے اندر ایک جنگ ہوتی ایک دل جو تعیش پرستی اور خود غرضی کی طرف لے جاتا تھا تو دوسرا ان کو سچائی اور انسان دوستی کی طرف لے جاتا تھا۔ آخر انہوں نے کلکٹری کے عیش و عشرت کو لات ماردی اور کسانوں کی زندگی کو بہتر بنانے اور ایسے نظام کے قیام کی جدوجہد شروع کر دی جس میں تمام محنت کش عزت، خوشحالی اور امن کی زندگی گزار سکیں۔

انہوں نے بتایا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ادبی کارنامے بھی بہت سے ہیں مگر انہوں نے قرآن کو عنوانوں کے تحت ترتیب دے کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس میں مختلف عنوانوں کے تحت جیسے کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی۔ اس بارے میں تمام آیتوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے سود کے بارے میں آیتوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے میں نے جب ان سے پوچھا اس کا فائدہ کیا ہے تو کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے کہا۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے\
پیران کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

افسوس یہ ہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے وہ کتاب اب تک چھپ نہیں سکی ہے جناب محمد فصیح نے کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی زندگی کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بارہا جیل کاٹی کسانوں کی ہر تحریک میں حصہ لیا ان کی جدوجہد کی وجہ سے کسانوں نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ ایوب خان اور بھٹو نے جو زرعی اصلاحات کیں وہ بھی اسی کسانوں کی تحریک کے بڑھ جانے کی بنا پر حکمرانوں کی مجبوری بن گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تحریک آج بھی جاری ہے۔ پٹ فیڈر میں جن ساتھیوں نے نوکر شاہی کے جبر کا مقابلہ کرتے ہوئے کسانوں کی حمایت میں بھوک ہڑتال کی۔ وہ سب حیدر بخش جتوئی کی تحریک کے سلسلہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان کی تعلیم اور جدوجہد سے ان نئے لوگوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اسی طرح تمام پاکستان میں جو کسانوں کی تحریکیں چل رہی ہیں اس میں جو لوگ زیادہ آگے بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں وہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی جدوجہد سے روشنی حاصل کرنے والے لوگ ہیں اور ہم جو یہاں بیٹھے ہیں وہ سب بھی کامریڈ حیدر بخش جتوئی اور ان کے جیسے دوسرے جیالوں کے نقش قدم پر چلتے ہوتے جدوجہد کے اس درجے پر پہنچے ہیں کہ ہم نے مارشل لا کو چیلنج کیا اور ہزار وارنٹوں کے باوجود یوم مئی کا جلوس نکالا۔ جناب فضل الرحمن نے اپنی تقریر میں کہا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی تحریک آج اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں اب اپنے اصلی دشمن سامراج کو پہچاننے لگے ہیں۔ اسی لئے آج ہم کو اپنے نعرہ "فسطائیت کا ایک جواب سامراج دشمن جمہوری محاذ" کو ہر غریب مزدور کسان تک پہنچانا چاہیئے اور آج کے دور میں حیدر بخش جتوئی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہی بہتر راستہ ہے۔

پیپلز پارٹی کراچی کے جوائنٹ سیکریٹری سردار حنیف نے کہا کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت کو اگر محدود طور پر دیکھا جائے تو سندھ کی ہاری تحریک کے بانی تھے اور وسیع تر انداز میں دیکھا جائے تو ہم انہیں بجا طور پر عالمی امن اخوت اور خوشحالی کے قافلہ کے سالاروں میں شمار کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم حیدر بخش جتوئی کو خراج تحسین صرف اسی انداز میں پیش کر سکتے ہیں کہ آج اس استحصالی دور میں جب ملک کے اندر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سامراج کے حاشیہ برداروں کے ہاتھوں سے غریب محنت کش اپنے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ مزدور طلبا کسان اور دیگر محب وطن عوام کو متحد کر کے پاکستان میں استحصال سے پاک معاشرہ کے قیام کے لئے جدوجہد کو تیز کیا جائے اس کے علاوہ جناب نیاز احمد نے نظم پڑھی اور محمد ایوب غلام نبی، عبدالمجید، اور غلام مصطفیٰ نے بھی خطاب کیا

اسی لاکھ روپے کا منصوبہ آبرسانی سرخ فیتے کا شکار ہو گیا

میرپور (آزاد کشمیر) ◎ شیخ محمد یونس اعظم

میرپور شہر میں آب رسانی کا مسئلہ ایک مستقل شکل اختیار کر چکا ہے۔ دن بدن اس میں شدت اور پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے عام صارف نہایت پریشان ہے اگر یہ مسئلہ چند سال جوں کا توں جاری رہا۔ تو عام شہری کو اس شہر سے یقیناً ہجرت کرنا پڑے گی۔ گیارہ سال قبل اس شہر کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی شہر میں چار ٹیوب ویل کام کر رہے تھے۔ اس طرح پانی وافر مقدار میں شہریوں کو مل رہا تھا لیکن گذشتہ چند برسوں میں شہر میں ایک تو تعمیراتی کام میں اور دوسرے آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے گذشتہ ۶/۵ برسوں سے مسئلہ آب رسانی و فراہمی ایک مستقل مسئلہ کی شکل میں ابھرا ہے۔ شہریوں، صارفین اور اہل میرپور کی طرف سے اس مسئلہ کے حل کے لئے بارہا وفود کی شکل میں، اخبارات آئینہ کے ذریعے حکومت سے مطالبات کئے گئے۔ لیکن کوئی بھی مثبت اقدام نہیں اٹھایا گیا، البتہ پچھلے سال این ٹی سی کو میرپور کے قصبہ جات میں چھ نئے اور شہر میں چار نئے ٹیوب ویل لگانے کے لئے ۸۰ لاکھ روپے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا جن کی سرگرمی تو کچھ عرصہ دیکھنے میں آئی۔ لیکن اب نا معلوم کیوں کام سرد مہری کا شکار ہو گیا ہے کمپنی نے دو جگہ ڈرلنگ کا کام بھی کیا، اور پانی نکلنے کی خوشخبری بھی سنائی لیکن بعد میں یہ کہہ کر کہ ان کی مشین کا کوئی اہم پرزہ پھنس گیا یا ٹوٹ گیا ہے۔ یکے بعد دیگرے دونوں مقامات کو چھوڑ کر اب کہیں اور آزمائشی مشق میں مصروف ہے۔ اس طرح یہ ۸۰ لاکھ کا منصوبہ بھی میرپور شہر کو فراہمی آب سے محروم کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ دوسری طرف پرانے ٹیوب ویلوں کی حالت یہ ہے کہ ان کی مشینری پرانی ہو چکی ہے۔ ان کی قوت کار میں زبردست کمی واقع ہوتی ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا خدشہ ہر وقت رہتا ہے جس کی وجہ سے پورا شہر بے آب و گیاہ چٹیل چٹان کسی بھی لمحے بن سکتا ہے۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے۔ کہ میرپور شہر سے صرف دو، تین میل کے فاصلے پر لاکھوں کیوسک فٹ پانی کا وسیع و عریض ذخیرہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے لیکن میرپور شہر کی ۸۰ ہزار نفوس پر مشتمل آبادی پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہی ہے۔ شہر میں صفائی کی حالت پانی کی کمی کی وجہ سے ناگفتہ بہ حالت تک جا پہنچی ہے لاکھوں روپے کی عمارات بدبو اور تعفن کے گھر بنے ہوتے ہیں۔ دن کو مکھی اور رات کو مچھر اپنی فنی سٹائل مہارت کے اعلیٰ کرتب پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک مقامی عملہ آب رسانی کا تعلق ہے وہ اپنے ذرائع کے پیش نظر شہر کی آبی ضروریات پوری کرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ لیکن اگر ذخیروں میں پانی نہ ہو تو عملہ کیا کر سکتا ہے۔ محکمہ آب رسانی کے اسٹاف کی بھی مشکلات ہیں جنہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا میرپور شہر ڈھائی تین میل لمبے اور ڈیڑھ دو میل چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے جب کہ عملہ آب رسانی کو اگر کسی نئی خرابی کو دور کرنے کے لئے سفر کرنا پڑے تو یقیناً آنے جانے میں گھنٹوں وقت لگتا ہے جس کی وجہ سے پانی کا ضیاع صارف کی پریشانی اور اہلکار کو آنے جانے کی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے محکمہ آب رسانی کے پاس کنوینس کا ہونا لازمی ہے۔ تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو سکے۔
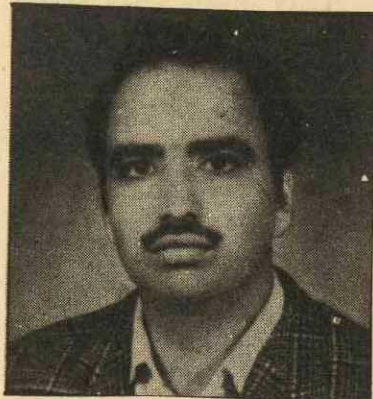
گو آب رسانی کی یہ عام مشکلات تھیں، لیکن اب جب کہ موسم گرما اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ شہر میں ہر طرف الامان والحفیظ کا عالم دیکھنے میں آ رہا ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں پانی کی کمیابی و نایابی کی شکایات آنا شروع ہو گئیں ہیں، صبح کے وقت پانی کوئی ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ گھنٹہ تک دیا جاتا ہے جب کہ شام کے وقت کچھ سیکٹروں میں تو پانی بالکل جاتا ہی نہیں اور جہاں کہیں جاتا ہے تو وہ بھی برائے نام اس طرح نہانا دھونا تو در کنار پینے کو بھی پانی نہیں ملتا اہلکاران آب رسانی کا اظہار ہے کہ پریشر نہ ہونے کی وجہ سے پانی نہیں پہنچتا۔ ورنہ اس میں ان کی کسی غفلت کو دخل نہیں، میرپور ترقیاتی اتھارٹی جو کہ آب رسانی کی ذمہ دار ہے، کو فوری طور پر اس طرف توجہ دے کر اس اہم ترین مسئلہ کے حل کے لئے اقدامات کرنا چاہئیں، تاکہ شہر میں پانی کی کمی، سپلائی کے ناقص انتظامات، سیوریج کے غیر صحت مندانہ انتظام اور سیوریج سسٹم کو بیکار ہونے سے بچایا جا سکے، یہاں پچھلے دنوں پانی کے نلکوں سے لمبے لمبے کیڑے برآمد ہوتے، جو اس بات کا ثبوت ہیں، کہ پانی کے ذخیروں کی صفائی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا، اور نہ ہی ادویات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ واٹر ٹینک بھی ننگے ہوتے ہیں، جن میں باہر سے گرد کے علاوہ دیگر اشیا داخل ہو جاتی ہیں، اور پانی کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ اس امر کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ ایم ڈی اے نے ۸۰ لاکھ روپے کا جو ٹھیکہ این ٹی سی کو نئے ٹیوب ویل نصب کرنے کے لئے دیا ہے۔ اگر ایم ڈی اے اسی رقم کو بروئے کار لا کر منگلا سے نہری پانی میرپور شہر کو سپلائی کرنے کے لئے پائپ لائن کا بندوبست کرے تو یقیناً یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے اور شہر کی نہ صرف موجودہ آبادی بلکہ آئندہ دس سال تک بڑھنے والی آبادی کے لئے بھی پانی مہیا کیا جا سکتا ہے۔

نواب شاہ ◎ محمد نواز خلجی

شہری کمیٹیاں یا قومی اتحاد کی کمیٹیاں

پیپلز پارٹی کا حامی ہونا سب سے بڑا "جرم" بن گیا

ملکی سطح پر حکومت بنے یا نہ بنے لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ نواب شاہ ضلع کے اتحادیوں کے لیے چھینکا ٹوٹ چکا ہے اور وہ قومی حکومت بنے بغیر ہی اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں ضلعی انتظامیہ نے مقامی اتحادی ہمنواؤں کو انتخاب کے بغیر ہی عوامی نمائندگی کے جملہ حقوق تفویض کر دیئے ہیں۔

گزشتہ ہفتے نواب شاہ کی ضلعی انتظامیہ نے ضلعی تعلقہ اور شہری سطح پر عوامی نمائندوں کی کمیٹیاں قائم کیں۔ ان کمیٹیوں میں پی این اے کے ان مقامی رہنماؤں اور کارکنوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جنہوں نے صوبائی یا قومی اسمبلی کا انتخاب تو بہت دور کی بات ہے اپنی زندگی میں کبھی بلدیاتی انتخاب نہیں جیتا۔ لہذا ایسے لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ لوگ انتظامیہ سے ملکر عوامی مسائل حل کرائیں گے قطعی بے سود ہے کیونکہ ان لوگوں کا کبھی عوام سے رابطہ ہی نہیں تو یہ عوامی مسائل سے کیسے واقف ہونگے۔ گزشتہ دنوں ہم ان ہی کالموں کے ذریعہ اس کمیٹی کی کارگذاری بیان کر چکے ہیں جو ضلعی انتظامیہ نے جنرل ضیاء الحق کی نواب شاہ آمد کے موقع پر ان کے حضور پیش کی تھی۔ تاکہ وہ انہیں مقامی مسائل سے آگاہ کر سکیں۔ اس کمیٹی نے جو مسائل پیش کیے تھے وہ صرف یہ تھے کہ فلاں سرکاری ملازم پیپلز پارٹی کا حامی ہے فلاں زمیندار ابھی تک بھٹو کے نام کی مالا جپتا ہے۔

ضلعی انتظامیہ نے اب بھی تقریباً ان ہی لوگوں کو عوامی نمائندگی کے جملہ حقوق تفویض کیے ہیں ان کمیٹیوں کے لیے منتخب کیے جانے والے افراد کی خوبیوں یا صلاحیتوں نے انتظامیہ کو متاثر کیا اس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں ہو سکتا ہے کہ ضلعی انتظامیہ کو ان کی یہ بات بھا گئی ہو کہ یہ لوگ عوامی مسائل سے کلی طور پر بے نیاز ہیں لہذا نہ یہ لوگ عوامی مسائل پیش کریں گے اور نہ ہی انتظامیہ کو ان مسائل کو حل کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی دردسری مول لینا پڑے گی گویا انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی عوامی مسائل کی بانسری۔ ضلعی انتظامیہ صرف چین کی بانسری بجاتی رہے گی۔

جہاں تک ان کمیٹیوں کی تشکیل کا تعلق ہے تو یہ ایک خانہ پُری والی بات ہے کیونکہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سے نواب شاہ کے کچھ مقامی پی این اے کے لیڈروں نے اپنے تئیں خود کو عوامی نمائندہ سمجھنا شروع کر دیا ہے اور وہ اسی حیثیت میں ہر سرکاری دفتر میں قدم رنجہ فرماتے ہیں گویا واقعی نواب شاہ کے شہریوں نے انہیں اپنی نمائندگی کا حق ادا کر دیا ہو حالانکہ نواب شاہ کے شہری انہیں پہلے کی طرح آج بھی ٹھکرا چکے ہیں مثال کے طور پر جب موجودہ ایس پی صاحب نے ان اتحادیوں کی دھونس میں آنے سے انکار کر دیا تو نواب شاہ ضلع کا پورا اتحاد حرکت میں آ گیا۔ اخبارات میں ایس پی کے خلاف بیان چھپوائے گئے۔ وفود مرتب کیے گئے اور انہیں کراچی و اسلام آباد صوبائی و مرکزی اعلیٰ احکام کے پاس بھیجا گیا کہ نواب شاہ ضلع کے عوام کی خواہش ہے کہ موجودہ ایس پی کا تبادلہ کیا جائے مگر جب ان اتحادیوں کے مکروہ عزائم کا نواب شاہ کے عوام کو پتہ چلا تو انہوں نے ہزاروں روپے کے برقیے اور درخواستیں بھیجکر اعلیٰ حکام کو آگاہ کیا کہ یہ اتحادی ہماری نمائندگی نہیں کرتے۔

جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ نواب شاہ شہر کے عوام جماعت اسلامی کے مصاحب علی، پی ڈی پی کے انعام اللہ خان، جمعیت العلماء پاکستان کے یعقوب قادری مسلم لیگ کے علی نواز دھراج اور غلام محمد جمالی جیسے لوگوں کو اپنی نمائندگی کا حق دینے کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کے نام عوامی نمائندہ کمیٹیوں میں سرِ فہرست ہیں۔

جہاں تک نواب شاہ شہر کا تعلق ہے تو یہاں پر جماعت اسلامی کے مصاحب علی، پی ڈی پی کے انعام اللہ خان اور جمعیت العلماء پاکستان کے یعقوب قادری نے پہلے ہی چودھراہٹ سنبھال رکھی ہے نواب شاہ شہر کے یہ خود ساختہ چودھری جو مارشل لاء سے قبل مختارکار کے دفتر میں چپراسی اور تھانے میں پہرہ پر کھڑے ہوئے سپاہی سے پوچھ کر قدم آگے بڑھاتے تھے کہ مختارکار صاحب یا صد بیدار صاحب کا موڈ تو ٹھیک ہے لیکن آج یہی صاحبان ہر سرکاری دفتر میں رات دن کا تمیز کیے بغیر دندناتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اگر یہ لوگ نواب شاہ کے شہریوں کو درپیش مسائل حل کرانے جاتے ہیں تو نواب شاہ کے شہری بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی بدولت آج تک کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا البتہ کچھ غریب لوگوں کو ناکردہ گناہ کی بناء پر تھانہ چوکی ضرور دیکھنا پڑا کیونکہ اتحادیوں کے نزدیک آجکل پیپلز پارٹی کا حامی ہونا بہت بڑا جرم ہے لہذا ان حضرات کو اپنا ہر مخالف پیپلز پارٹی کا کارکن دکھائی دیتا ہے حکام کے سامنے اپنے ہر مخالف کو پیپلز پارٹی کا حامی ثابت کرنے کے لیے یہ حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں اب یہ بات انتظامیہ کے سوچنے کی ہے کہ کیا ایسی کمیٹیاں جن کے ارکان کو عوام کا اعتماد حاصل نہ ہو عوامی مسائل حل کر سکتی ہیں یا نہیں۔ ●

منڈی بہاؤالدین

محمد انور دانش

نثاراں کا اغوا

انتظامیہ اور پولیس کی سرد مہری

تین ماہ بیت گئے ملزم سلامتے دندناتے پھرتے ہیں اور انتظامیہ سب کچھ جانتی ہے اس کے باوجود میری مغویہ بیٹی مجھے واپس نہیں دلائی جا سکی۔ شاید اس لئے کہ غربت و بے چارگی میرا سرمایہ اور بدنصیبی مقدر بن کے رہ گیا ہے۔ اگر یہی بیٹی کسی افسر یا سرمایہ دار کی ہوتی تو انتظامیہ اُسے زمین کی تہوں سے بھی نکال لاتی۔ چاہے

ملزموں کا سراغ تک نہ ہوتا! یہ باتیں موضع بھکھی تحصیل پھالیہ کی رشیداں بی بی بیوہ عبدالرشید نے انتہائی دکھ بھرے انداز میں کہیں۔ اس نے مارشل لاء حکام کے نام اپنی مختلف درخواستوں کا ذکر بھی کیا۔

رشیداں بی بی نے تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی بیٹی نثاراں کو ۱۸ فروری کو مبینہ طور پر گاؤں کے ایک شخص جمال دین نے مسمیان علم دین، خوشی محمد الٰہ داد اور یاسین کی مدد سے اغوا کر لیا اور پانچ ہزار روپے کے قریب نقدی، زیورات و پارچات بھی اٹھا لے گئے جو عمر بھر کی پونجی تھی، پولیس نے مغویہ کی بازیابی کے لئے قطعی تعاون نہیں کیا اور بیٹی کو واپس حاصل کرنے کے لئے تین ماہ کی تمام کوششیں اکارت گئی ہیں۔ اس نے بتایا کہ سات آٹھ سال قبل خاوند کی زندگی میں نثاراں کا رشتہ حقیقی بھتیجے محمد یامین کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ ان کے دو بچے چھ سالہ سرفراز اور دو سالہ ساجدہ پروین میرے پاس ہیں۔ یامین اور نثاراں میرے ہی ساتھ رہتے تھے اور آج بھی یامین اور بچے میرے پاس ہیں۔ رشیداں بی بی نے مبینہ طور پر الزام لگاتے ہوئے کہا۔ جمال دین ایک با اثر زمیندار اور شادی شدہ ہے۔ اس کی بیٹی تین بچوں کی ماں ہے۔ رشیداں بی بی نے کہا کہ جمال دین "کبھی کبھار" اس کے اور یامین کے بچوں کو غریب سمجھ کر امداد بھی کرتا رہا ہے۔ مجھے اس کی سخاوت کے پس پردہ انجانے شبہات پیدا ہونے لگے تو میں نے اُسے بچوں کی امداد کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس نے لاعلمی میں نثاراں جیسی معصوم بیٹی سے رابطہ رکھا جو بالآخر اس کے اغوا پر منتج ہوا۔

رشیداں بی بی نے ایک رقعہ دکھایا جس پر بھیجنے اور وصول کرنے والے کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ اس میں نہ آنے کی صورت میں خاندان کو برباد اور بھائیوں کو قتل کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ رقعہ کی عبارت یوں ہے۔

السلام علیکم! کے بعد واضح ہو کہ آپ کا رقعہ مجھے مل گیا ہے اور پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے آپ کو واضح ہو کہ ۱۲/۵ کو منڈی پہنچ جائیں۔ آپ بیمار ہو جائیں اور نھی کو لے کر اڈے پر چلی جائیں اور اڈے پہ پہنچ کر نھی کو کہیں کہ آپ کا کرایہ لگتا ہے آپ گھر چلی جائیں وہ گھر چلی جائے گی۔ آپ ٹانگے پہ چڑھ کر منڈی پہنچ جائیں منڈی جا کر ڈاکٹر مقبول حسین کی دکان پہ جائیں۔ وہاں جا کر پھر میاں کی کوٹھی کا تو آپ کو پتہ ہے وہاں جا کر مختار سے ملیں کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آپ کو مل جاؤں گا۔ وہاں یہ کام بالکل ٹھیک ہو جائے گا رقعہ کے ساتھ دس روپے بھی ہوں گے۔ آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں اور اس رقعہ کا جواب جلدی دیں۔ جب تک رقعہ کا جواب نہیں آتے گا میرے دل کو چین نہیں آئے گا۔ برقعہ اور چادر لے آنا۔ رقعہ کا جواب جلدی دیں۔ اگر تم نہ آئی تو میں تمہارے خاندان کو برباد کر دوں گا۔ میں آپ کے بھائیوں کو قتل کر سکتا ہوں اور میرا کوئی کچھ نہیں کرے گا۔"

بیوہ رشیداں کے مطابق مذکورہ رقعہ اور نثاراں کا شناختی کارڈ اس وقت ملا جب نثاراں جا چکی تھی، اور گھر میں چیز لبست کی پڑتال کی جا رہی تھی۔ رقعہ دیکھتے ہی نثاراں کے بڑے بھائی محمد لطیف نے انکشاف کیا کہ دو روز قبل یہ رقعہ عمران مستقن نے بازار میں اس سے پڑھوایا تھا۔ چنانچہ عمران مستقن سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ رقعہ اسے جمال دین نے دیا تھا۔ اور نثاراں کو پہنچانے کے لئے اس نے بیت الخلا کی صفائی کرتے ہوئے وہاں رکھ دیا تھا۔

رشیداں بی بی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یامین کا والد عبدالمجید نثاراں کے اغوا کے صدمہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ بیمار پڑ گیا اور شرم و غیرت کے اس بیمار نے بالآخر ۱۲ مئی کو دم دے دیا۔ آج تک مجھے اپنی بیٹی نہیں مل سکی۔ انتظامیہ اور پولیس خاموش تماشائی بنی ہوتی ہے۔

▦

اصلاحی کمیٹیاں اور شہدادپور کے صحافی

تاج حیدری

سیاسی سرگرمیوں پر پابندیوں نے وڈیروں کی ہاریوں پہ مظالم توڑنے والی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا ہے اور وہ جہاں زیادہ وقت کھاد، بیج، پانی، ٹیوب ویل اور ٹریکٹر وغیرہ کے حصول پہ خرچ کرتے ہیں وہاں ظالمانہ سرگرمیوں پر بھی کچھ وقت صرف کر دیتے ہیں۔ اس عالم میں مولانا کوثر نیازی اور پیر پگارا سے ملاقات کے بعد جام خاندان وڈیروں میں دودھ بتاشے بانٹ رہا ہے اور اس رابطہ کے زیر اثر آنے والوں میں غلام مصطفےٰ جونیجو، غلام حیدر وسان، غلام قادر جونیجو، عبداللہ وسیا کے نام قابل ذکر ہیں لیکن یہ حضرات وفاداری کی تبدیلی کے مسئلہ پر سوچنے کا بہانہ کئے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ورکروں کو یہ پیغام بھی دیتے رہتے ہیں کہ "آخر کیا کیا جائے عوام کی خواہش کے خلاف کم از کم اس دور میں چلنا مشکل ہے، اگر بھٹو صاحب کو بچانا ہے تو مولانا کوثر نیازی سے سمجھوتہ بہت ضروری ہے۔"

وڈیروں کے اس انداز فکر سے قطع نظر ان کی خواہش کے مطابق قومی حکومت تشکیل نہ پا سکی اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ مگر اس طرف سے مایوس ہو کر وہ گھر نہیں بیٹھ گئے بلکہ اصلاحی کمیٹیوں کی فہرستوں میں اپنا نام شامل کرانے کے سلسلے میں سرگرمیاں تیز کر دیں۔ آخر کار ان سرگرمیوں کے نتائج گذشتہ ہفتے نکل آئے ضلع سانگھڑ اور تحصیل کمیٹیوں میں نامزد کئے جانے والوں میں مسلم لیگ (پگارا) کے خدا بخش نظامانی، میر محمد وسان، محمد خان جونیجو، عبدالقادر سنجرانی، خلیفہ عاقل ہنگورو، جام انور علی، قاضی عزیز اختر اور عزیز الدین شاہ، مولانا کوثر نیازی مارکہ پی پی کے غلام مصطفےٰ جونیجو، روشن جونیجو، بھائی خان وسان، غلام حیدر وسان۔ جماعت اسلامی کے محبوب الٰہی، مزدور رہنما سومرو عبدالرزاق، ریٹائرڈ ایس پی عبدالحق، ریٹائرڈ میجر عبدالعزیز اور اقلیت کے سیٹھ بھامنداس۔ ان کے علاوہ دو صحافی بھی اس کمیٹی میں شامل ہیں جن میں سے ایک تو پگارا گروپ کے اخبار کے نمائندے ہیں۔ دوسرے جنگ کراچی کے۔

ضلعی کمیٹی جو کہ انیس افراد پر مشتمل ہوگی وہ تو مذکورہ افراد کی نامزدگی سے پوری ہوگئی۔ ضلع سانگھڑ کی پانچ تحصیلیں بھی ہیں جن کے لئے ۵۰ افراد کو نامزد کیا گیا ہے یعنی ہر تحصیل کے لئے دس افراد۔ شہدادپور کے لئے جن دس افراد کو نامزد کیا گیا ہے ان میں سے قابل ذکر افراد یہ ہیں مسلم لیگ پگارا کے علی محمد وسان مسکین فقیر، ڈاکٹر غیاث الدین۔ جماعت اسلامی کے محمد رمضان۔ پی پی نیازی مارکہ کے عبدالواحد بروہی۔ مزدور رہنما شوکت راجپوری، پیر پگارا کے اخبار کے نمائندے خورشید احمد، اس فہرست میں ایک سولہ گریڈ کے سرکاری افسر اور پی پی کے امیر رہنما عبدالسلام تھیم کے بھائی عبدالرحمٰن

تھہیم کا نام بھی شامل ہے۔ پتہ نہیں یہ سولہ گریڈ کا سرکاری افسر اس اصلاحی کمیٹی میں کس کی ایما اور مرضی سے شامل کیا گیا ہے؟

ان کمیٹیوں کی تشکیل اور اس میں شامل افراد کے ناموں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ ان کا وجود اور عدم وجود عوام کے لئے برابر ہی ہے۔ ہاں، یہ نامزد افراد سرکاری اہل کاری اور اپنے "ناقابل بیان" مفادات کی تکمیل بخیر و خوبی انجام دینے کے اہل ہیں۔

صحافیوں کی ملک گیر پُرامن جدوجہد کے سلسلے میں شہداد پور کے باضمیر صحافی برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دنوں کراچی سے کراچی پریس کلب کے سکریٹری حبیب غوری اور ہلالِ پاکستان کے غلام نبی مغل یہاں تشریف لاتے اور صحافیوں سے ملاقات کی۔ ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور سانگھڑ شہر روانہ ہوگئے۔ ان دوستوں کے روانہ ہونے کے بعد ان چھ صحافیوں کو حکام کی طرف سے پیش ہونے کا حکم ملا۔ اور نثار بالادی، قمر ملک، دلاور خان، الیاس ابڑو، محمد رمضان اور تاج حیدری حسب حکم مارشل لآ حکام سانگھڑ کے سامنے پیش ہوتے۔ مارشل لآ حکام نے ان سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "ہماری رپورٹ کے مطابق تم لوگوں نے کراچی سے آتے ہوتے صحافیوں کے ساتھ میٹنگ کی اور امن دامان کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیا یہ سچ ہے"۔ اس کے جواب میں لائق حاضر صحافیوں نے مارشل لآ حکام کو بتایا کہ آپ کی اطلاعات "صحت مند" نہیں ہیں۔ کراچی سے ہمارے دوست ضرور ہمارے پاس آتے اور ہم نے ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا لیکن کوئی خفیہ میٹنگ نہیں کی اور نہ ہی امن دامان کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا کیونکہ ہم پی ایف یو جے جس انداز میں جدوجہد کر رہی ہے اس انداز پر یقین رکھتے ہیں اور پُرامن بھوک ہڑتال کے موقف کی کھلی حمایت کرتے ہیں۔

مبینہ طور پر مارشل لآ حکام کے سامنے پی ایف یو جے کے موقف کے حامی صحافیوں کی پیشی دراصل ان صحافیوں کی کارستانی کا نتیجہ تھی جو استحصالی مالکان اور رجعت پرست سوچ کا پرچار کرنے والے اخبارات کے ساتھ منسلک ہیں اور پیشے پر صحافی کا بلّا لگا کر صحافیوں کے مفادات کو سبوتاژ کرتے، مخبری کرنے اور حکام سے مراعات حاصل کرنے ہی کا مکروہ کام کرتے ہیں۔

"مجاہدین شرافت" سرکاری ملازمتیں چاہتے ہیں!

پچھلے کچھ دنوں سے روزنامہ نوائے وقت اور صحافت وغیرہ نے "فحاشی" کے خلاف مہم چلا رکھی ہے۔ اس دفعہ اس "جہاد" کا نشانہ کشور ناہید، سرمد صہبائی، محمد خالد اختر اور سعادت حسن منٹو کو بنایا گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے لئے تو یہ الزام کچھ نئے نہیں ہیں کہ وہ زندگی سے لے کر موت کے لمحے تک اور مر جانے سے لے کر آج تک بار بار ان الزامات سے گزر چکا ہے۔ ہر بار سنتا ہے، ہنستا ہے اور پھر اگلے ہی روز اس کی تحریریں پھر سے اُن مجاہدوں کا مذاق اڑانے لگتی ہے جو "فحاشی" کے خلاف "علم شرافت" بلند کرتے ہیں۔ اس بار شروع ہونے والے اس "جہاد" میں ایک بات منٹو ہی کے حوالے سے کچھ مختلف ہے کہ براہِ راست منٹو کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ بلا آزادے نے نہیں کیا، بلکہ منٹو کی فحاشی کے بہانے کشور ناہید کو نوکری سے نکلوانے کا چارہ کیا گیا ہے اور "مجاہدین شرافت" کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہوا ہے کہ اس خاتون نے گریڈ نمبر پانچ سے گریڈ نمبر انیس تک ترقی کیوں کی۔ پھر یہ بھی کہ یہ ترقی بھٹو حکومت کے دور میں ہوئی اور چونکہ بھٹو حکومت فحاشیوں کو بہت پسند کرتی تھی اس لئے کشور ناہید بھی ترقیاں حاصل کرتی گئی۔

"مجاہدین شرافت" کی منطق کو ذرا پھیلا دیا جائے تو پھر ہر اس شخص کو تنزل کی راہ اختیار کرنی ہوگی جسے بھٹو کے دور میں ترقی ملی اور جو آج تک نہ صرف اُس ترقی کے پھل بھی کھاتا ہے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتا ہے اور اسی ترقی یافتہ مسند کو استعمال کر کے بھٹو کی دی گئی ناجائز ترقیوں کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

ان مجاہدین شرافت نے منٹو کو فحش قرار دیتے وقت اور پھر منٹو کی فحاشیوں کے بہانے کشور ناہید کو نشانہ بناتے وقت یہ بھی نہیں سوچا کہ اسی ملک کے قانون کے تحت منٹو کے خلاف مقدمات چلائے گئے تھے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قانون نے منٹو کی جس جس تحریر کو "فحش" قرار دے کر اس پر پابندی لگائی، وہی تحریریں شائع بھی ہوئیں اور اُن پر سے پابندیاں بھی اٹھالی گئیں۔ جب عدالت نے منٹو کو بری کر دیا اور اس کی تحریروں کو قابلِ تعزیر اور فحش قرار نہ دیا تو بھی ان "مجاہدین شرافت" کو خیال نہیں آیا کہ ایسی الزام بازیاں کر کے نہ صرف اپنے ہی قانون کا مذاق اڑا رہے ہیں بلکہ توہینِ عدالت کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں

ذرا اور تخصیص سے بات کی جائے تو نوائے وقت کے کالم نگار کے وہ ارادے بھی واضح ہو جاتے ہیں جو ان کے کالم میں پنہاں ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے کبھی بھی معاشرے میں زندگی میں اور خصوصاً عوام کی صفوں میں جی کر ان کڑوی کسیلی حقیقتوں کا سامنا نہیں کیا جن کو وہ عریانی اور فحاشی قرار دیتا ہے یہ کالم نگار ہمیشہ اپنی حویلی کی دیوار کے روزن سے دیکھتا ہے اور جب کوئی ایسی حقیقت اس کی آنکھ کے عدسے سے ٹکرا جاتی ہے۔ جو تاریخ کی ناقابل تردید جدلیاتی وارداتوں سے منعکس ہوتی ہے تو یہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے ملتان میں قتل ہونے والے مزدوروں کی لاشیں بھی نظر آتیں۔ لاشیں جن پر کفن تو کجا کوئی چیتھڑہ تک نہ تھا اور جو اس کی ستر پوشیوں پر ماتم کناں تھیں۔ اس کے روزن سے اسے آج تک صحافیوں کی کمریں بھی نظر نہیں آتیں جن پر کوڑوں کے لاشے آزادئ تحریر کے نقوش بن کر ابھرے ہوتے ہیں لیکن نہیں اسے عریانی نظر آتی تو لیس یہی کہ کشور ناہید کی ترقی ہوئی تھی سو بین السطور اس کا مطالبہ ہے کہ کشور ناہید کی تنزلی ہونی چاہیئے، سوال یہ ہے کہ کشور ناہید کی ترقی ہی کیوں باعث آزار ہے، امجد اسلام امجد کی ترقی پر کیوں گلہ نہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خود عطاء الحق قاسمی کے اپنے سفرنامے اور ان سفرناموں میں اس کی عیاشیوں کے بیان کیوں کسی عریانی اور فحاشی کے زمرے میں نہیں آتے اور پھر یہ بھی کہ خود عطاء الحق قاسمی بھٹو حکومت کے دور میں سرکاری ملازمت کے گریڈ نمبر ۱۷ پر فائز ہو کر نوائے وقت میں بھٹو حکومت کے خلاف لکھتے رہے اور ان کے خلاف کوئی کاروائی کیوں نہ ہوتی ہ اس کو یہ بات تو نظر آتی ہے کہ اب کشور ناہید کا انجام بخیر نہ ہونا چاہیئے لیکن یہ حقیقت کیوں نظر نہیں آتی ٹیلی ویژن کارپوریشن سے نکالے گئے کارکنوں کا جو انجام بدخیر کروایا گیا ہے اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ ادیبوں کی انجمنوں میں یہ صاحب احمد ندیم قاسمی گروپ سے منسلک ہوتے ہیں لیکن ان کا موقف ہمیشہ نوائے وقت کا موقف ہوتا ہے۔

رہی بات صحافت نامی اس اخبار کی جس میں ایک مولانا صاحب نے پھر مدصہباتی کی نظم کو فحش قرار دیا منٹو کے اقتباسات کو فحش قرار دیا اور پھر محمد خالد اختر کے ایک افسانے کو فحش بنا ڈالا۔ تو قصہ صرف اتنا ہے کہ فحاشی کا لیبل لگانے والوں کو اتنی عقل ہی نہیں کہ فحاشی کسے کہتے ہیں۔ اگر انہیں اتنی عقل ہوتی تو کم از کم انہوں نے یہ ارادہ بھی کیا ہوتا کہ دنیا بھر کی سامراج دشمن تحریکوں کو لذت پرستی اور پرپگیاٹزم کے چکروں میں ڈال کر امریکی اور یورپی لٹریچر جو کردار ادا کر رہا ہے اس کی تردید یا مخالفت میں بھی کوئی تحریک شروع ہو سکے۔ لیکن نہیں، ان لوگوں کو ان حقائق کا ادراک نہیں ہوگا کیونکہ یہ پاکستانی ادب کو بھی ان حقیقتوں کے اظہار سے منع کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو ان کے استحصالی معاشرے کے پردے چاک کر دیتی ہیں۔ سرمد کی جس نظم پر انہیں اعتراض ہوا ہے کیا اس سے کسی جنسی لذت کی شہادت ملتی ہے؟ کیا اس میں ذہنی اور جنسی عیاشی کا پرچار ہے؟ یہ لوگ اُس کرب کو محسوس تک نہیں کر سکتے جو کالی عورت کے کالی عورت ہونے میں ہے۔ لذت پرستی یقیناً انسان دشمنی ہے لیکن کیا کسی لذت پرست سے کرب انگیز حقیقت کا اظہار ممکن ہے۔

ان "مجاہدین شرافت" کو کوئی کیسے سمجھائے کہ فحاشی اور عریانی تب ہوتی جب شاعر اُس عورت کے تھنوں کے تل کو جنسی لذت کی کشش کا باعث بننے والی "خوبصورتی" کی علامت بناتا، پھر شاعر کو یہ تل اندھیری رات کے عذابوں کا نشان محسوس نہ ہوتا۔ اس عورت کی سانسیں شاعر کے سینے کے چیتھے پودے کی مانند نہ جم جاتیں۔ اُس عورت کے نیلے پیر کیوں ہوتے؟ کالا منہ اور نیلے پیر کا محاورہ آخر کیا معانی رکھتا ہے۔ انسان کو جنم دینے والی یہ عورت چڑیل کی صورت میں کیوں ڈھل گئی، اور ابروں کو گھنلانے کا باعث کیوں بن گئی، اس کی شکلیں کیوں بدلنے لگیں۔ اس کی ناف کو لذت کے دوزخ کا استعارہ کیوں بنایا گیا۔ کیا اس دوزخ کا تصور، اس ڈائن نما عورت کا تصور اور اس ستم کا تصور جس نے اس عورت کو کالی عورت بنایا کسی انسان کو جنسی عیاشی کی ترغیب دے سکتا ہے۔ یہ نظم بہت ڈراونی ہے کہ انسانوں کے لبادوں کو اتار کر انہیں ننگے کر کے وہ حقائق ظاہر کر دیتی ہے جو ہمیں ضمیر کی ملامت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اب اگر مولانا نعیمی یا ان کی قبیل کو اس نظم میں کالی عورت محکوم انسانوں کی زندگی نہ لگے، اور وہ جنسی لذت میں غوطے کھانے لگیں اور پھر احساس گناہ میں شرابور ہو کر سرمد کو گالیاں دینے لگیں تو اس میں سرمد کا قصور نہیں، قصور پڑھنے والے کی ذہنیت کا ہے۔ ان نظموں اور افسانوں پہ اعتراض کیا گیا ہے۔

آج ان معترضوں کی چلتی ہے، سو جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ لیکن اگر ایسی حقیقت پسندانہ نظموں یا افسانوں کو فحش قرار دینا ہے تو پھر سب سے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ رومی، سعدی اور وارث شاہ کی کتابوں پر پابندی لگا دی جاتے۔

اب ذرا غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ رومی، سعدی یا وارث شاہ پیان "صحافتوں" اور "نوائے وقتوں" نے کیوں اعتراض نہیں کیا۔ جواب بہت مختصر ہے، بات اتنی ہے کہ رومی، سعدی اور وارث شاہ کسی سرکاری عہدے پر کام نہیں کر رہے، ان کو نوکری سے نکلوا کر ان کی کرسی پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹوڑی میں [illegible]ی کی وارداتوں میں اضافہ

کامل ابوپوٹو

سندھ کے دیہات میں چوری چکاری، ڈاکے، رہزنی اور رسہ گیری عام بات ہے اور اس طرف متعلقہ محکمہ بالکل توجہ نہیں دیتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چوروں، ڈاکوؤں رسہ گیروں اور رہزنوں کو مقامی وڈیروں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور متعلقہ محکمہ وڈیروں ہی کے تابع ہوتا ہے اس کے باوجود بھی جب غریب ہاری اور محنت کش ان سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو حکام بالا سے رجوع کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر وہی کچھ موثر اقدامات کریں۔

دیہہ چھٹوڑی جو نو سعید آباد تعلقہ ہالہ سے تقریباً گیارہ میل دور ہے میں آجکل سماج دشمن عناصر نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کیا ہوا ہے اور کسی پرامن شہری کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے چونکہ چھٹوڑی میں کوئی پولیس چوکی نہیں ہے اور شہریوں کو فریاد کرنے کے لیے گیارہ میل کا سفر کرنا پڑتا ہے اس لیے چوروں، ڈاکوؤں، رسہ گیروں اور رہزنوں کے حوصلے زیادہ بلند ہیں۔

چھٹوڑی کے پرامن شہریوں کا ارباب اقتدار سے مطالبہ ہے کہ وہ کچھ ایسے اقدامات کریں کہ شہریوں کی جان مال عزت اور آبرو سلامت رہے۔ اور انہیں سماج دشمن عناصر اور ان کے پشت پناہوں سے نجات ملے۔

اے شبِ زنداں جاگ ابھی

اے شبِ زنداں جاگ ابھی
تیرا کل بھی میرے ہی کل جیسا ہے
ہر ہر لحظہ میرے پل پل جیسا ہے
تیرا آج بھی آج نہیں
تو بھی محکومِ ظلمت ہے
اور میرا بھی راج نہیں
بجھنے نہ پائے آگ ابھی
اے شبِ زنداں جاگ ابھی

جوہر منیر

رملہ شیرازی

صبح مانند شام ہوتی ہے
شب کو تارے اداس لگتے ہیں
جانے کیسی بہار ہے ابکے
سبز شاخوں سے پھول جھڑتے ہیں

مضمحل اسقدر ہوائیں ہیں
سانس گھٹنے لگی ہے سینوں میں
یوں فضاؤں میں تیرگی ہے نہاں
بے کلی بڑھ رہی ہے ذہنوں میں

اس اندھیرے کے باوجود اے دوست
دور اک شمع اب بھی جلتی ہے
وقت کے ساتھ ہر گھڑی ہر پل
آس کی موج آگے بڑھتی ہے

لسانی ہنگاموں کا منصوبہ اور اسلامی جمعیت طلبہ

سندھ یونیورسٹی میں چنگاری کو دبانے کی کوششیں

احسان عظیم

سیاسی محاذ تو سناٹے کی نذر ہے لیکن معاشی محاذ پر گزشتہ چند ہفتوں سے ایک اضطراب کی لہر دوڑ رہی ہے خصوصی زرعی شعبہ سے تعلق رکھنے والوں پر اچانک مشکلات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ مشکلات کا پہاڑ زرعی زمین کے ڈھل (مالیے) کی شرح میں چار گنے اضافے کی شکل میں سامنے آیا ہے سندھ کی دیہی آبادی مارکیٹ میں بیج کھاد اور دیگر آلات کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے پہلے ہی پریشان تھی کمرے پر سود رے کی شکل میں اب ڈھل کا اضافہ بھی گلے پڑ گیا۔ سیاست پر پابندی ہے مارشل لا حکومت کے زرعی مشیر ممکن ہے زرعی مضامین کے اچھے استاد ہوں لیکن جہاں تک سندھ کے زرعی حالات کا تعلق ہے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ انہیں اس کا حقیقی ادراک شاید نہیں ہے جبھی وہ ڈھل کے اضافے سے پیدا ہونے والی صورتحال کو سامنے نہیں رکھ پائے۔ یا یہ کہ نوکر شاہی نے ان کے کندھوں پر رکھ کر گولی چلا دی ہے نوکر شاہی کے ہاتھوں سندھ اور اس کے ہاریوں کا حال پہلے ہی خستہ تھا اب یہ نیا تازیانہ مزید بے چینی کا سبب بن رہا ہے فی الحال تو زبان بند ہے لیکن جیب پر بڑا بوجھ اثر توڑ ڈالے گا۔

یہ خبر تو آپ کی نگاہ سے گذر چکی ہو گی کہ گزشتہ دنوں سندھ یونیورسٹی میں طلباء کے دو گروہوں کے درمیان شدید تصادم ہوا۔ طلباء کے ایک گروہ نے یونیورسٹی کی بسوں پر قبضہ کر کے لے گئے۔ یونائیٹڈ پروگریسو فرنٹ نے اپنی پریس کانفرنس میں یونیورسٹی کے ماحول کو خراب کرنے کی ذمہ داری جیئے سندھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن پر ڈالی ہے جبکہ بعض رجعت پسند جماعتیں پس پردہ طلباء کے درمیان موجود اختلافات کو لسانی تنازعے میں بدلنے کی مذموم کوشش میں مصروف ہیں۔ سندھ یونیورسٹی گزشتہ کئی ماہ تک بند رہنے کے بعد ابھی صرف دو ہفتے پیشتر کھولی گئی تھی۔ یونیورسٹی کھلتے ہی یونین کے انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ انتخابات میں جیئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مقابلے میں سپاف، این ایس ایف اور ایس این ایس ایف کے طلباء یونائیٹڈ پروگریسو فرنٹ بنا کر مشترکہ طور پر انتخاب میں مقابل ہیں۔ ماضی میں جیئے سندھ فیڈریشن طاقت کے بل بوتے پر سندھ یونیورسٹی پر چھائی ہوئی تھی موجودہ وائس چانسلر شیخ مبارک علی ایاز تعلیمی صورتحال کو معمول پر لانے میں کامیاب ہوئے تھے اسی دوران ملک میں مارشل لا نافذ ہوا۔ جماعت اسلامی اور جیئے سندھ فیڈریشن نے شیخ ایاز سے بدلہ لینے کے لیے زبردست مخالفانہ مہم چلائی۔ لیکن شیخ ایاز نوکری میں آنے کے بعد نوکری کے طور طریقے سیکھ چکے تھے۔ اپنے خلاف چلنے والی مہم کو ناکام بنا چکے تھے لیکن جماعت اور جیئے سندھ درنوں اتنی آسانی سے شکست ماننے پر تیار کیسے ہو سکتی ہیں طریقہ کار تبدیل کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲ مئی کی صبح سابق میجر محمد افضل ثاقب صاحب کے صاحبزادے یونیورسٹی کیمپس میں گئے اور اشتعال انگیزی کی۔ آخر میجر کے بیٹے ہیں معمولی آدمی کے نہیں۔ بات بڑھ گئی۔ تشدد کے نتیجہ میں بعض طلباء زخمی ہوئے۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا۔ اسلامی جمعیت طلباء کے ارکان شہر کے اولڈ کیمپس میں جمع ہوئے۔ بسوں پر قبضہ کر لیا۔ بعض طلباء چند بسوں پر سوار ہو کر مارشل لا حکام کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ دوسری طرف سندھ یونیورسٹی میں افواہ اڑائی گئی کہ شہر میں سندھی طلباء کو زدوکوب کیا جا رہا ہے افواہ تو افواہ ہوتی ہے جنگل کی آگ کی طرح پھیلی سندھ یونیورسٹی میں کشیدگی پہلے ہی تھی اب کیا تھا جو سامنے آیا۔ تشدد کا شکار ہوا۔ اطلاعات کے مطابق ۸ طلباء شدید زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہوئے۔ مارشل لا حکام یونیورسٹی پہنچ چکے ہیں بظاہر صورتحال پر کنٹرول کر لیا گیا ہے شیخ ایاز کا بھی یہی کہنا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن راکھ میں چنگاریاں اب بھی دبی ہوئی ہیں۔ اگر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ تو شیخ ایاز سے چھٹکارہ اور انتخاب میں رجعت پسندوں کی کامیابی کس طرح ہو گی؟ جماعت اسلامی اور دیگر رجعت پسند جماعتوں کی عوام میں گرتی ہوئی سیاسی ساکھ کو بھی سہارا دینا ہے مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے آخر کچھ تو چاہیے لسانی تفرقہ سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ اپنے خلاف سازشوں سے خود کو محفوظ بنائیں۔

قاضی صاحب شتر مرغ نہ بنیے

پلاٹ نمبر، سروے اور کوائف حاضر ہیں

احسان عظیم

صاحبو! یہ قاضی برادران والے قاضی محمد اکبر بھی دلچسپ چیز ہیں۔ برادران کے ذکر سے تاریخی برادران یوسف کا خیال بھی ذہن میں آتا ہے لیکن میں تو اپنے قاضی محمد اکبر صاحب کا ذکر کر رہا ہوں۔ سندھ میں مقولہ مشہور ہے کہ قاضی کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ لیکن میرے لئے یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ اس لئے کہاوتوں پر کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اس پرانی کہاوت کو ضرور دہراؤں گا۔ کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" "راہی" کے شمارے نمبر ۵۱ جلد ۲ میں اندرونِ سندھ کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے دور میں فیض یاب ہونے والوں کا احوال بیان کیا تھا اور ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تیری جوانی تک والی بات ہوئی۔ کہ قاضی برادران کی بات کر بیٹھا بے چارے قاضی صاحب عمر کے اس حصّے میں پہنچ چکے ہیں کہ جس میں حقائق کا سامنا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے چنانچہ حقیقت برداشت نہ کر سکے اپنے سندھ نیوز کے "نئے دور" کے کالم میں "راہی" اور اس کے نمائندے پر اپنی فطرت کے مطابق خوب خوب برسے اور بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اعلان کیا کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے دور میں کوئی پلاٹ حاصل نہیں کیا۔ اس معصومیت پر کیا کہا جائے۔

قاضی صاحب، مال ملکیت کا حصول کوئی نفظی شعبدہ نہیں ہے یہ تو پیسوں کا لین دین ہے سفید کاغذ پر کالے لفظوں میں لکھا جاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کی بلڈنگ کے لیے میونسپل پلاٹ حاصل نہیں کیا گیا اگر واقعی روشنی میں دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے ممکن ہے آپ کو میونسپل کارپوریشن کے ریکارڈ میں کچھ نظر نہ آیا ہو لیکن لوگوں کی آنکھیں دیکھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں اسی لیے ہمیں معلوم ہے کہ ڈائریکٹر سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ لمیٹڈ یعنی آپ کے صاحبزادے مرحوم سلیم قاضی نے سندھ کے چیف منسٹر مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی کے حضور درخواست پیش کی کہ انہیں وارڈ ڈی میں سٹی سروے نمبران ۲۴۵۵، ۲۴۵۴، ۲۴۵۳، ۲۴۴۵، اور ۲۴۵۶ کے مقابل سڑک کا ٹکڑا قیمتاً فروخت کر دیا جائے چیف منسٹر صاحب نے بکمالِ مہربانی حکم فرمایا کہ

"یہ میونسپل سڑک کا ٹکڑا) درخواست گذار کو الاٹ کر دیا جائے" اس سلسلے میں میونسپل کارپوریشن کے اس وقت کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر منظور اکبر نے کمشنر حیدرآباد کو جو میونسپل کارپوریشن کی کنٹرولنگ اتھارٹی بھی تھے۔ پلاٹ کے بارے میں صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مکتوب نمبر ۶۶۶/۵۸ مورخہ ۱۲ جولائی ۷۵ء کے ذریعہ واضح کیا کہ۔

"پلاٹ جس کے لیے درخواست کی گئی ہے یعنی سی ایس نمبر ۲۴۵۶ موجودہ تانگہ اسٹینڈ کا حصّہ ہے اور اسی لیے ماضی میں بھی دیگر افراد کو الاٹ کرنے سے انکار کیا جا چکا ہے"

"حال ہی میں مخدوم رفیق الزمان نے عزت مآب وزیر بلدیات کے حکم مورخہ ۲۳ دسمبر ۷۳، ۱۹ء کے ذریعہ دو سو روپے فی گز ننانوے سالہ لیز پر الاٹمنٹ کا پروانہ حاصل کیا تھا لیکن اس حکم کو بھی اسی سبب سے رد کر دیا گیا تھا۔"

"ڈائریکٹر سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ لمیٹڈ کی درخواست بھی اسی سروے نمبر یعنی سی ایس ۲۴۵۶ کے ایک حصّے کے لیے ہے جو سڑک ٹائمنگ سینٹر اور تانگہ اسٹینڈ کے لیے مختص ہے۔"

"اس کے علاوہ اس پلاٹ کے قابضین کے لیے گزرگاہ بھی ہے۔ اور ان کا استحقاق بھی۔"

ایڈمنسٹریٹر پیپلز میونسپل کمیٹی حیدرآباد کے اعتراض اور سندھ پیپلز لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۱۹۶۲ء کی دفعہ ۳۵ (۵) (۲) کی پابندی کو نظر انداز کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے چیف منسٹر سندھ مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے ۱۹۰۴ مربع فٹ رقبہ سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ لمیٹڈ کو آلاٹ کر دیا جو آپ کے صاحبزادے اسلم قاضی کے نام فروخت کی گئی۔

ابتدا میں پلاٹ کی قیمت دو سو دو روپے مربع گز مقرر ہوئی لیکن دوبارہ آپ کے صاحبزادے مسٹر محمد اسلم اکبر ولد قاضی محمد اکبر اور محمد عثمان نے ایک مشترکہ درخواست سابق وزیر بلدیات جام صادق علی کے حضور پیش کی جام صادق علی تو بادشاہ تھے پورا کراچی بیچ کھایا حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے پلاٹ کی حیثیت ہی کیا تھی اور پھر درخواست کرنے والے بھی کوئی اور نہیں قاضی محمد اکبر کے صاحبزادے تھے پھر بھلا شرف قبولیت حاصل کیوں نہ ہوتا جام صادق علی کا ارشاد ہوا۔

"مشترکہ درخواست گذاروں کی درخواست معقول نظر آتی ہے یہ دونوں پڑوسیوں اور ساتھ ساتھ میونسپل کارپوریشن کے لیے بھی مناسب ہوگی میونسپل زمین کے ٹکڑے کا ڈسپوزل بھی اسی قیمت پر کیا جائے جس قیمت پر سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ لمیٹڈ نے برابر کا پلاٹ حاصل کیا ہے یہ مارکیٹ کے نرخ کا حقیقی اظہار ہوگا زمین کو ننانوے سالہ لیز کے بجائے فروخت کیا جانا چاہیئے۔ ضروری اقدام بلاتاخیر کیا جائے۔"

چنانچہ پلاٹ کی قیمت دو سو روپے فی مربع گز سے گھٹا کر ایک سو چھ روپے چوہتر پیسے مقرر کر دی گئی قیمت میں کمی کا ابھی زیادہ دن بھی نہیں گزرے قیمت میں کمی اور فروخت کی کمشنر حیدرآباد کی منظوری سے میونسپل کارپوریشن کے مکتوب نمبر 75/MC/H/82 مورخہ ۴ مارچ ۷۷ء ۱۹ سے عمل میں آئی۔ میونسپل ریکارڈ سے یہ بھی تصدیق ہوئی ہے کہ گندے پانی کی نالی کا میونسپل کے خرچ پر رخ تبدیل کیا گیا اور سیاسی دباؤ کے ذریعہ پلاٹ کی قیمت کم کرائی گئی۔

اس سارے معاملے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ سندھ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ لمیٹڈ کی بلڈنگ تو پہلے ہی تعمیر کر لی گئی جبکہ اس کا پلان میونسپل کارپوریشن نے گذشتہ سال ۲۱ مئی ۷۷ء ۱۹ کو منظور کرایا گیا۔ الاٹمنٹ آرڈر کی رو سے گندے پانی کی نالی کے ساتھ پانچ فٹ کا رقبہ کچرا نکالنے کے لیے چھوڑنا تھا۔ لیکن نالی کا رخ موڑ کر اس ٹکڑے پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ساتھ میں بکھا دیری کی سڑک کی دیوار کو بھی قبضہ میں لے لیا گیا۔ اس طرح ۱۹۰۴ فٹ کے منظور شدہ رقبے کو تقریباً دگنا کر لیا گیا۔ پھر بھی معصومیت کا یہ انداز!

ایک دستاویز دوسری دستاویز کی تردید کرتی ہے

بقیہ صفحہ ۱۵ سے آگے

کمیونسٹوں، سوشلسٹوں، برلوں اور ان تمام لوگوں کو جو منصفانہ رویے اور عام آدمی کے ساتھ منصفانہ سلوک پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے اور ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ صرف اپیل کنندہ کے خلاف ذاتی مخاصمت نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے کیونکہ بقول ان کے اپیل کنندہ بائیں بازو کی طاقتوں کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ وہ خود (جنرل ضیا الحق) دائیں بازو والوں کو کاز، نجی شعبے کی کاز، قومی ملکیت کو ختم کرنے کی کاز، سخت لیبر پالیسی کی کاز، غیر محدود نجی ملکیت کی کاز کے چیمپئن ہیں اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر۔ یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ وہ کیوں صرف اپیل کنندہ بلکہ اس کے خاندان، اس کے رفقاء کار اور اس کی سیاسی جماعت کے خلاف ہیں جبکہ پی ایم ایل اے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اُن کی اسلام کی تشریح بے راہ ہے۔ اسلام ایک روشن خیال اور ترقی پسند مذہب ہے۔ یہ جامد نہیں ہے، یہ تعلیماتی ہے یہ منصفانہ روش اور سماجی انصاف کے حق میں ہے۔ یہ عام آدمی کے فلاح و بہبود کے حق میں ہے۔ یہ اس کے حق میں ہے جس کی وضاحت قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال نے کی ہے۔

اور اپیل کنندہ اسلام اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عقیدت میں خود کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ وضاحت کرنے میں بڑی تکلیف برداشت کی ہے کہ کئی ممالک اور حکومتوں کے سربراہوں کی جانب سے صدر کے سزائے موت میں تخفیف کے اختیار کے استعمال کی اپیلیں اس مرحلے پر نامناسب ہیں کیونکہ اپیل کنندہ کی اپیل سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس اختیار کا اس اپیل سے کوئی تعلق نہیں جس پر سپریم کورٹ غور کر رہا ہے۔ یہ اختیار کسی بھی وقت استعمال ہو سکتا ہے چاہے مقدمہ زیر سماعت ہو یا اس کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہو جیسا کہ خود انہوں نے نیپ کے لیڈروں کے مقدمے میں کیا ہے جو حیدرآباد اسپیشل کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ مؤدبانہ گزارش ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کبھی بھی مقدمے کے زیر سماعت ہونے کی پرواہ نہیں کی۔ خاص طور پر اس وقت جب یہ مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کنندہ کے خلاف زیر سماعت تھا۔ انہوں نے بار بار غیر ملکی اور قومی اخباری نمائندوں سے کہا کہ اپیل کنندہ قاتل اور خائن تھا۔ اب بھی جب کہ اپیل کنندہ کی اپیل سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے انہوں نے غیر ملکی اخباری نمائندوں سے یہ کہہ کر اپیل کنندہ کے مقدمے کو نقصان پہنچانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ اپیل کنندہ تیز چالاک ہے اور یہ کہ ہائی کورٹ میں مقدمے کی کارروائی منصفانہ جائز اور قانون کے مطابق تھی! ایسی بات جو اپیل کنندہ کی اپیل میں معرض بحث میں ہے۔

(۳۸) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے ضرورت سے زیادہ آسان بناتے ہوئے یہ قرار دیا کہ استغاثے کے گواہوں کو اپیل کنندہ کے خلاف مخاصمت نہیں تھی اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس مقدمے میں جھوٹی گواہی دیتے۔ سماعت کرنے والی بنچ نے بعض گواہوں کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن ٹربونل کے سامنے دیئے گئے بیانات بدلنے کے لیے اس عذر کو تسلیم کر لیا کہ اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ جھوٹے بیانات دینے پر مجبور تھے۔ ریکارڈ پر ایسی کوئی بات نہیں جس سے یہ الزام ثابت ہوتے ہوں کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے سماعت کرنے والی بنچ یہ دیکھنے میں ناکام رہی کہ کوئی بھی فرد واحد میں نہیں تھا کسی گواہ کو ہفتوں یا مہینوں کے لیے نظر بند نہیں کیا گیا کسی گواہ کو ملازمت سے برطرف نہیں کیا گیا یا انہیں کسی طریقے سے ہراساں نہیں کیا گیا جب وہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹربونل کے سامنے شہادت دے رہے تھے۔ البتہ یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مخاصمت اور عناد کی ایسی فضا ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے موجود تھی۔ اور اپیل کنندہ کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمے کی کارروائی کے دوران جاری رہی اور آج تک جاری ہے۔ اسلام کے چیمپئنوں کی طرف سے سرکاری ملازمین کو ڈرایا، دھمکایا، دباؤ ڈالا اور مجبور کیا گیا کہ اپیل کنندہ کے خلاف جھوٹی گواہی دیں۔ ایک حلف نامہ جس پر "H" کا نشان شناخت لگایا گیا ہے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ایک ایسے افسر کی مثال پیش کی جائے جس نے ہدایات پر عمل کرنے اور جھوٹی گواہی دینے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں اسے مہینوں قید تنہائی کی سزا بھگتنی پڑی اور اسے سرسری طور پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا حالانکہ وہ اٹھائیس سالہ بہترین ملازمت کا شاندار ریکارڈ رکھتا تھا۔

(۳۹) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے فیصلے میں کئی پیراگراف ملک کے اسلامی کردار اور اسلام کے مساوات اور قانون کے تصور کے لیے وقف کیے ہیں۔ اس نے نشاندہی کی ہے کہ اسلام کے خلیفۂ اول نے حکمرانوں کے غلط اقدامات پر عوامی تنقید کی دعوت دی۔ لیکن سماعت کرنے والی بنچ یہ محسوس کرنے میں ناکام رہی کہ خلیفۂ اوّل اسلامی ریاست کے صرف انتظامی سربراہ ہی نہیں بلکہ مفتی اعظم (چیف جسٹس) بھی تھے۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی پر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جائے۔ اسلام میں بند کمرے میں کارروائی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی کی ایک تقریر کے حسب ذیل اقتباس سے دیکھا جا سکتا ہے :-

> "عدالتی نظام میں جاری و ساری اصول یہ تھا کہ نہ صرف انصاف کیا جاتے بلکہ یہ دکھایا بھی جاتے انصاف ہو رہا ہے۔ تمام مقدمات کی سماعت کھلی عدالت میں ہوتی تھی اور عدالتی نظام میں خفیہ کارروائی کی کوئی مثال نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ سے قبل رسول اللہ کے ایک صحابی نے کافروں کو ایک خط لکھا اور ان پر عنقریب ہونے والے حملے کی اطلاع دی۔ یہ خط برآمد کر لیا گیا۔ یہ جاسوسی کا ایک کھلا ہوا معاملہ تھا۔ عہد جدید کے لوگ کہیں گے کہ ایسے خطرناک مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہونی چاہیئے تھی لیکن رسول اکرمؐ نے ایک مسجد میں کھلی کارروائی کی۔"

(۴۰) سماعت کرنے والی بنچ نے استغاثے کی شہادت مکمل ہونے کے بعد بند کمرے میں کارروائی کی۔ بند کمرے میں

کارروائی کرنے کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اپیل کنندہ سماعت کرنے والی بینچ پر تنقید کرے گا اور اس کی غیر جانبداری پر حملہ کرے گا۔ نتیجۃً کارروائی بند کرنے میں اس جواز پر جاری رہی کہ گڑبڑ کا اندیشہ تھا حالانکہ یہ رائے قائم کرنے کے لئے کوئی ثبوت یا جواز نہیں تھا۔

(۳۱) کہ سماعت کرنے والی بینچ نے کئی موقعوں پر وکیل اور خود اپیل کنندہ توہینِ عدالت کے تحت اقدام کی دھمکیاں دیں یہاں تک کہ اس نے فیصلے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے توہینِ عدالت کا قانون جو عدالت کو اختیار دیتا ہے کہ توہین کرنے والے کو چھ ماہ قید کی سزا دے' بے وقعت ہے۔ اور سفارش کی ہے کہ اس سقم کو دور کرنے کے لئے ضروری قانون منظور کیا جائے۔ اس عدالت کی سو سال سے زیادہ کی تاریخ میں کسی جج نے اس قسم کی سفارش کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس عدالت عالیہ کے لئے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اپیل کنندہ کے مقدمے کو نقصان پہنچانے اور پہلے سے فیصلہ دینے کی صورت میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے عدالت کی توہین کے ارتکاب کی طرف ایک درخواست کے ذریعے واضح طور پر سماعت کرنے والی بینچ کی توجہ مبذول کرائی گئی۔ لیکن سماعت کرنے والی بینچ نے جو ویسے تو اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ کوئی فرد قانون سے بالا نہیں ہے اور اسلام میں مساوات کے تصور پر بحث کی ہے، اس درخواست کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس معاملے میں درخواست پر کوئی حکم صادر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ سماعت کرنے والی عدالت کی جانب سے برتے جانے والے دوہرے معیار دوبارہ نمایاں ہوگئے کہ مساوات کے تصور کا انطباق سابق منتخب وزیر اعظم پر ہوتا تھا لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو، یقیناً دوسروں سے زیادہ مساوی تصور کیا جاتا تھا۔

(۳۲) خود استغاثے کی شہادت سے یہ بات واضح ہے کہ مبینہ سازش لاہور کے واقعے کے بعد یعنی ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو اختتام کو پہنچ گئی۔ استغاثے کے گواہ ۲۔ وعدہ معاف، مسعود محمود نے صفحہ ۷۵ پر اپنی گواہی میں کہا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں اسی سہ پہر ملتان سے روانہ ہوا۔ ہماری راولپنڈی واپسی پر مجھے مسٹر بھٹو نے طلب کیا۔ وہ چڑچڑے اور مشتعل تھے انہوں نے کہا کہ اصل کام ابھی ہونا باقی ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ کے ایماء پر آپ کے اپنے قائم کردہ ایک خیال پر عمل کیا گیا اور میرے توسط سے وہ میاں عباس تک پہنچا جنہیں آپ کی ہدایات پہلے ہی میرے پیشرو کے توسط سے پہنچ چکی تھیں اور یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپ سے مجھ سے اور میرے ماتحتوں سے اللہ تعالیٰ حساب لے گا، لیکن اب میں مزید اس قسم کے احکامات پر عمل نہیں کروں گا"۔

پھر صفحہ ۸۵ پر اس نے کہا۔

"یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ ایف ایس ایف کی طرف سے ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے بعد احمد رضا قصوری کی جان لینے کی کوئی کوشش کی گئی۔ کیونکہ احمد رضا قصوری کے پیچھے لگنے کے لئے وزیر اعظم کے حکم کے باوجود میں نے مسٹر محمد عباس سے کہہ دیا تھا کہ یہ نہیں کیا جائے گا"۔

مبینہ اور واحد اس سازشی مسعود محمود کے اس واضح بیان کے پیش نظر سماعت کرنے والی بینچ کے لئے کوئی سبب نہیں تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور کے واقعے کے بعد بھی سازش جاری رہی۔ اس کے پیش نظر اپیل کنندہ کے بعد کے مبینہ رویے سے متعلق شہادت ناقابل قبول تھی اور اسے ریکارڈ پر نہیں لایا جانا چاہیے تھا یا کسی بھی صورت میں اسے زیر غور نہیں لایا جانا چاہیے تھا۔

(۳۳) کہ سرکاری خطوط کتابت اور دوسری دستاویزات جن پر استغاثے نے انحصار کیا ہے ان سے غلط معنی نکالے گئے ہیں اور ان کی غلط تشریح کی گئی ہے جس سے اپیل کنندہ کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ سماعت کرنے والی بینچ نے خود کہا ہے کہ یہ دستاویزات بذات خود ملوث کرنے والی نوعیت کی نہیں ہیں۔ اور اس کے باوجود جھوٹی شہادتوں کی روشنی میں اور اندازوں کی بنیاد پر ان کی تشریح کرتے ہوئے سماعت کرنے والی بینچ نے ان سے بھیانک معنی اخذ کئے ہیں بمثال کے طور پر احمد رضا قصوری کے دورۂ کوئٹہ کے بارے میں ایف ایس ایف کے افسروں کے درمیان آنے جانے والے خطوط صرف روزمرہ کی نوعیت کے تھے انٹیلی جنس کے افسروں کے درمیان خطوط کا تبادلہ عام معمول ہے پھر بھی سماعت کرنے والی بینچ نے ان پر اپیل کنندہ کے خلاف ثابت کرنے والی شہادت حصوں پر انحصار کیا ہے۔ اسی طرح دوسری ایسی دستاویزات جو بطور شہادت قابل قبول بھی نہیں، نہ تو مستند تھیں نہ مصدقہ، ان پر نہ صرف انحصار کیا گیا ہے بلکہ اپیل کنندہ کے مفاد کے خلاف ان کی غلط طور پر تشریح کی گئی ہے۔

استغاثے کا مقدمہ یہ ہے کہ یکم فروری ۱۹۷۵ء کو سعید احمد خان نے ایک نوٹ (ڈی ۱ ایکس پی۔ ڈبلیو ۳/۳۔ ڈی) انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے ڈائریکٹر جنرل کو بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایس ایس پی اصغر خان اور تحقیقاتی افسر ڈی ایس پی ملک محمد وارث نے ۲۹ جنوری ۱۹۷۵ء کو مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کے ٹریبونل کے روبرو جو شہادت قلم بند کرائی ہے۔ اسے اخبارات میں تشہیر دی جائے۔ اس دستاویز کی ایک نقل جو وزیر اعظم کو ۲ فروری ۱۹۷۵ء کو پہنچی اس پر وزیر اعظم نے صرف دستخط کئے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ سعید احمد کی تجویز کو منظور کرتے ہیں لیکن سماعت کرنے والی بینچ نے اس دستاویز اور اس کی نقل پر وزیر اعظم کے دستخط سے معنی نکالتے ہوئے اسے ثابت شدہ حقیقت (پیراگراف ۵۰۷) قرار دیا ہے کہ وزیر اعظم نے سعید احمد کی تجویز منظور کرلی تھی۔ اس غلط نتیجے سے سماعت کرنے والی بینچ نے دوسرے غلط نتیجے پر جست لگائی تاکہ دکھا سکے کہ اس مواد کی تشہیر میں وزیر اعظم کو گہری دلچسپی تھی۔ فیصلہ مزید کہتا ہے کہ ان کی منظوری کے نتیجے میں ان دو پولیس افسروں کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کے ٹریبونل کے روبرو دیئے گئے بیانات کی تشہیر کی گئی۔ تجویز یکم فروری ۱۹۷۵ء کو سعید احمد کی طرف سے پیش کی گئی۔ وزیر اعظم نے اس نوٹ کی نقل پر ۲ فروری ۱۹۷۵ء کو صرف دستخط کئے۔

نوٹ کی اس نقل سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے خود اس کی استغاثے کی اپنی پیش کردہ دوسری دستاویز (ایکس۔ پی۔ ڈبلیو۔ ۳/۳۔ الف) سے تردید ہو جاتی ہے جس کے ذریعے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے سعید احمد کو مطلع کیا کہ اصغر خان اور ملک محمد وارث کے بیانات کو پہلے ہی ۳۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو تشہیر مل چکی ہے۔

سیدھی سادی دستاویزات سے غلط مطلب نکالنے اور غلط تشریح کرنے اور انہیں بھیانک معنی

پہنچانے کی مذکورہ بالا صرف ایک مثال ہے۔

کہ اپیل کنندہ کے بعد کے رویّے کا ایک پہلو جسے فاضل سماعت کرنے والی بینچ نے کافی اہمیت دی ہے یہ ہے جسے وہ احمد رضا قصوری حفاظتی انتظامات اور عبدالحمید باجوہ کی اہمیت توڑ کر ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کے واقعے کے بعد سازش پر عمل کرنے کی کوشش کہتی ہے۔ سماعت کرنے والی بنچ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ عبدالحمید باجوہ احمد رضا قصوری کو غیر مسلح اور بغیر حفاظت پانا چاہتے تھے تاکہ وہ ان پر حملہ کر کے انہیں ختم کر دیں۔ استغاثے کے مقدمے کی روشنی میں ریکارڈ کا ایک سرسری جائزہ بھی اپیل کنندہ کے شہادت کے اس حصے سے جوڑنے کی غلط کوشش کو ظاہر کر دے گا۔ یہ کسی کا مقدمہ نہیں ہے کہ مرحوم عبدالحمید باجوہ کا مبینہ سازش سے کوئی تعلق تھا۔ کہ رپورٹ (ای ایکس پی ڈبلیو ۱/۲۸) جو استغاثے کے گواہ ۲۸۔ عاشق محمد لودھی نے پیش کی ہے وہ یا تو اپیل کنندہ کے ایما پر حاصل کی گئی ہے یا یہ کبھی انہیں دکھائی گئی تھیں۔

یہ بات شہادت میں موجود ہے کہ احمد رضا قصوری نے صوبہ سرحد سے چند افراد کو اپنے بندوقچیوں کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ اور ان میں سے چند کو ان کی رہائش گاہ پر متعین کیا گیا تھا۔ قواعد کے برخلاف احمد رضا قصوری کا یہ بندوقچی نہ صرف اسمبلی کی عمارت میں مسلح جایا کرتا تھا بلکہ مہمانوں کی گیلری اور کیفے ٹیریا میں بھی جایا کرتا تھا۔ یہ عبدالحمید باجوہ کے متعینہ معمولی فرائض کے دائرے میں تھا کہ وزیر اعظم کی حفاظت کے ابتدائی انتظامات اور یہ پتہ چلائیں بندوقچی کون تھا جسے احمد رضا قصوری بار بار دی جانے والی اپنی دھمکیوں پر عملدرآمد کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ تاکہ اپنے والد کی موت کا انتقام لے سکیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو عدالت کے ریکارڈ پر بھی موجود ہے۔ اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ جب اسمبلی کا اجلاس جاری نہ ہوتا تو وزیر اعظم اکثر اسمبلی آیا کرتے تھے۔

یہ دستاویز وزیر اعظم کو بھیجی تک نہیں گئی تھی۔ یہ رپورٹ قومی اسمبلی کے اسپیکر اور راولپنڈی رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجی گئی تھی جو حفاظتی انتظامات کے ذمہ دار تھے۔

(۴۶) کہ استغاثے کے گواہ ۴۳، عبدالحیئ نیازی کی شہادت ناقابل قبول تھی۔ کیونکہ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت قلمبند شدہ اس کا سابقہ بیان صفائی کو فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ تحقیقاتی افسر استغاثے کے گواہ ۴۱، ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اپنی شہادت میں تسلیم کیا ہے کہ پولیس ڈائریوں میں اس کا بیان موجود تھا۔ ویسے بھی اس گواہ نے تحقیقاتی ٹربیونل کے روبرو اپنے سابقہ بیان میں جو ٹھوس اضافے کیے ہیں ان کے پیش نظر اس کی شہادت کسی وقعت کے لائق نہیں۔

(۴۷) اسی طرح دونوں سلطانی گواہوں مسعود محمود اور غلام حسین کے بیانات جو پولیس نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۱ کے تحت قلمبند کیے تھے فراہم نہیں کیے گئے۔ اس نے بھی اپیل کنندہ کے مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور ان کی گواہیوں کو ناقابل قبول بنا دیا۔

(۴۸) کہ سماعت کرنے والی بنچ غلط طور پر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں سعید احمد کو ہدایات دیتے یا کسی اور طریقے پر تحقیقاتی ادارے کے کام میں مداخلت کر کے یا مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کے ٹربیونل کے روبرو ہونے والی کارروائی پر اثر انداز ہو کر اپیل کنندہ نے تحقیقاتی افسروں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوششیں کیں۔ ایسے نتیجے تک پہنچنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ خود سعید احمد کے کہنے کے مطابق اپیل کنندہ پر پہلی بار یہ الزام لگا کہ اس نے مبینہ طور پر جنوری ۱۹۷۵ء میں کسی وقت ان سے یہ کہا تھا یعنی وقوعے کے دو مہینے بعد کہ لاہور جا کر دیکھیں کہ ٹربیونل میں کیا ہو رہا ہے۔ ریکارڈ پر ایسی کوئی بات نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس تاریخ سے قبل اپیل کنندہ نے اس معاملے کی تحقیقات میں کسی طرح بھی دلچسپی لی ہو۔ یہ ایک مشہور واقعہ تھا جسے نومبر ۱۹۷۴ء سے بے حد تشہیر ملی تھی کہ احمد رضا قصوری نے ایف آئی آر میں اپیل کنندہ کا نام لکھوایا ہے اور یہ ایک لغو بات ہے کہ اس قدر تاخیر سے سعید احمد کو میدان میں اتارا جاتے کیونکہ ٹربیونل کے روبرو وزیر اعظم کا نام لیا جا رہا تھا۔

(۴۹) مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کو ڈیفنس سیکرٹری کی طرف سے خط ملنے پر حیران رہ جانے کی جو کہانی سعید احمد نے گھڑی ہے وہ نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس وقت سعید احمد اس حقیقت کا پوری طرح علم رکھتے تھے۔ ایمونیشن کی نوعیت کس نوعیت کا تھا اور اس حقیقت سے بھی کہ اس بور کا ایمونیشن ایف ایس ایف سمیت دوسری سول آرمڈ فورسز کے زیر استعمال تھا۔ نیز یہ بھی کہ کئی شہریوں کے پاس بھی قانونی اور غیر قانونی طور پر دستیاب تھا۔ سعید احمد کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن کا ٹربیونل بھی اس حقیقت سے باخبر تھا اس لیے اس کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ڈیفنس سیکرٹری کے خط کی اطلاع ٹربیونل کو دیتے لیکن میلو ڈرامائی طریقے پر انہوں نے یہ جھوٹی کہانی گھڑی ہے تاکہ اپنی وزیر اعظم سے ملاقات کے لیے جواز فراہم کر سکیں۔ اور یہ کہ اس ملاقات میں اپیل کنندہ نے انہیں ڈیفنس سیکرٹری کے خط کو ٹربیونل کے سامنے پیش کرنے سے مبینہ طور پر روک دیا۔

(۵۰) کہ سماعت کرنے والی بنچ نے یہ فیصلہ کرنے میں بھی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اپیل کنندہ نے مسٹر جسٹس شفیع الرحمٰن ٹربیونل کی رپورٹ کی اشاعت کو روک دیا کیونکہ وہ مخالفانہ تھی۔ سعید احمد جو خود اپنے اظہار اور استغاثے کے دوسرے گواہوں کے مطابق شریک کار تھا کی شہادت اس نکتے کے سلسلے میں بھی اتنی ہی بے وقعت ہے جتنی کہ کسی دوسرے نکتے پر۔

(۵۱) سماعت کرنے والی بنچ نے مقدمے کی سماعت انتہائی غیر منصفانہ مخالفانہ اور تنگدلانہ انداز میں کی۔ اس معزز عدالت کی توجہ گذشتہ موقعوں پر اس پہلو کی طرف منعطف کرائی جا چکی ہے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران سماعت کرنے والی بنچ کے مختلف احکام اور اظہار رائے پر اعتراضات اٹھائے گئے۔ اور ان کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن یا تو انہیں نظر انداز کر دیا گیا یا مسترد اور بعض اوقات تو انہیں ضبط تحریر میں لائے بغیر ہی رد کر دیا گیا۔ اپیل کنندہ کی درخواست مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں اس غیر قانونی بے قاعدہ اور جابرانہ انداز کی چند مثالیں بیان کی گئی تھیں جو مقدمے کی کارروائی کے دوران اختیار کیا گیا۔ ان درخواستوں کے احکام استرداد اور جس انداز میں انہیں مسترد کیا گیا وہ مقدمے کی کارروائی اور سماعت کرنے والی بنچ کے فیصلے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی اسباب فراہم کرتے ہیں۔ سماعت کرنے والی بنچ اس بات کا تعین کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا کہ اپیل کنندہ نے مقدمے کی کارروائی شروع ہونے سے قبل اور کارروائی کے دوران تعصب اور عناد کے جو اسباب پیش کیے تھے۔ وہ قطعیت اختیار کر چکے تھے۔ اپیل کنندہ اس اپیل میں، مسٹر جسٹس مشتاق حسین کی زیر صدارت سماعت کرنے والی بنچ کے تعصب اور عناد کے بارے میں پیش کیے گئے اسباب کو دوہراتا ہے۔

مقدّمے کی کارروائی کے منصفانہ ہونے سے متعلق درخواستوں اور خاص طور پر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کی درخواست کو سرسری طور پر مسترد کرنے کے احکام سماعت کرنے والی بنچ اپیل کنندہ کے خلاف تعصّب عناد اور خصومت کو ثابت کرتے ہیں۔

باقی آئندہ

سرحد

شہزاد غزنوی

بھٹو کی ضرورت اور اشیائے ضرورت
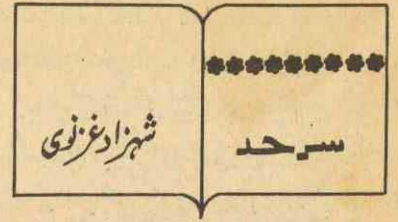
بسا اوقات ہاتھوں کی لگائی ہوئی گرہیں دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے اپنے دور اقتدار میں جن پارٹی ورکرز عہدیداروں اسمبلی کے اراکین اور وزراء کے خلاف تحقیقاتی فائلیں کھولیں آج وہی فائلیں خوفناک عفریت بن کر پیپلز پارٹی کو کھانے کے لیے مسلسل اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ سرحد میں پیپلز پارٹی ابتدا سے ہی دو مختلف گروہوں میں بٹ چکی تھی پہلے ایک گروپ حق نواز گنڈاپور سے موسوم تھا۔ اور دوسرا حیات شیر پاؤ۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد جب گنڈاپور شہید ہو چکے تھے تو دوسرے گروپ کی قیادت اقبال جدون وغیرہ کے تعاون سے عنایت گنڈاپور نے سنبھال لی تھی۔ اور بعد میں آنے والے وزیر اعلیٰ نصر اللہ خٹک بھی شیر پاؤ کے مخالف گروہ میں گنے جاتے تھے شیر پاؤ کے قتل کے بعد نصر اللہ خٹک نے اپنا گروپ ترتیب دیا جو ابتدا سے ہی پارٹی سیکرٹری اطلاعات مولانا کوثر نیازی کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ مارچ کے انتخابات کے بعد جب خٹک کو وزارت اعلیٰ کے عہدے سے ہٹایا گیا تو مسٹر حیات شیر پاؤ کے بھائی میجر آفتاب شیر پاؤ وزیر بلدیات بنے تو انہوں نے اپنے بھائی کے مخالف گروہوں کے بعض ایسے لوگوں کے فائل کھلوائے جن پر بدعنوانیوں کا شبہ تھا وقت لد گیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب پیپلز پارٹی پر احتساب کا عمل شروع ہوا تو فوجی جنتا نے ابتدا سے ہی منصوبہ بندی کر لی تھی کہ اگر پارٹی عوامی مقبولیت سے محروم نہیں ہوتی تو اس کے حصے بخرے کرنے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ جب بھٹو کی سزائے موت بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی مسلسل نظربندی پیپلز پارٹی کے بڑے قائدین کی قید و بند کارکنوں کی پیٹھوں پر پڑنے والے کوڑے بھی پارٹی کو عوامی حمایت سے محروم نہ کر سکے۔ تو پارٹی کا شیرازہ بکھیرنے کے عمل کا آغاز کیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں بھٹو حکومت کے دور کی بنائی ہوئی فائلیں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ اور اسی طرح میجر آفتاب شیر پاؤ کی کھولی ہوئی فائلیں سرحد میں پیپلز پارٹی کو دولخت کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

پیپلز پارٹی بلاشبہ عوام الناس میں بھٹو پارٹی کے نام سے موسوم ہے اور اس میں کتنا ہی بڑا جادوگر غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ سرحد کے وہ لوگ جو کل تک پیپلز پارٹی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے آج محض اس لیے پارٹی کی حمایت کر رہے ہیں کہ لوگ یہ جان گئے ہیں کہ پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کی مخالفت عوام کی سطحوں پر نہیں بلکہ وائٹ ہاؤس کے نکالے گئے احکامات کی روشنی میں کی جا رہی ہے اس وقت پیپلز پارٹی کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے لوگ اس لیے حمایت نہیں کر رہے کہ سرحد کی قیادت میں کوئی بھاری بھرکم شخصیت یا فعال قیادت موجود ہے بلکہ لوگ بھٹو کے نام پر پیپلز پارٹی کا ساتھ دے رہے ہیں

سرحد اس وقت ضروریات زندگی کی اشیاء سے بری طرح محروم ہو رہا ہے آٹا گھی شکر تیل مناسب داموں پر عوام تک پہنچانے میں یہ حکومت بری طرح ناکام ہو چکی ہے سیمنٹ سکینڈل کی کہانیاں سرکاری ایوانوں سے نکل کر گلی کوچوں میں آگئی ہیں۔ سیمنٹ کی فراہمی جب ایک مسئلہ بنی تو سرحد کی فوجی جنتا نے اس شیئے کو چھپانے کے لیے جب شہری کمیٹیاں تشکیل دینے کا پروگرام بنایا کہ اپنی کمزوریوں اور ناقص منصوبہ بندی کو عوام کے سر تھوپ سکے تو شوق اقتدار میں پیپلز پارٹی کا وہ حلقہ بھی اس میں شریک ہو گیا۔ جو مرکزی کمیٹی کے فیصلے کے خلاف عمل کرنے پر لبرل پارٹی کو گالیاں دیتا ہے پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ حکومت سے کسی سطح پر مفاہمت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مرکزی کمیٹی اس کے لیے فیصلہ نہ کرے۔ ۲۲ رکنی ٹولہ اس فیصلے کے خلاف عمل کرنے پر پہلے ہی مطعون کیا جا چکا ہے۔ اب پی پی کے بعض ایسے شرکار کا نام سیمنٹ کمیٹیوں میں آنا فیصلے کی خلاف ورزی ہی قرار دیا جا سکتا ہے

ولی خان، بیگم ولی خان اور این ڈی پی کے سرکردہ لیڈروں کی ملک سے غیر حاضری کے سبب سیاسی محفلیں اجڑی اجڑی سی لگتی ہیں۔ بیان اور ردِ بیان کے سلسلے مفقود ہیں لیکن میدان سیاست میں خلاء کو پورا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو سٹیج پر بیٹھے کیا کرتے ہیں جماعت اسلامی جس کا وجود سرحد میں نہ ہونے کے برابر ہے چھپکلی کی طرح الٹی ہو کر سیاست کی شہتیر کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ مارشل لاء کی لاٹھی سے خوفزدہ کر کے اکہ جیسے یہ لاٹھی ان کے ہاتھ میں ہے، وہ لوگوں میں اپنے راستے بنانا چاہتی ہے۔ جماعت اسلامی کے زعماء یہ برملا کہتے ہوئے نہیں چوکتے کہ اتحاد کی جماعتیں خواہ کچھ ہی کہتے آئینی حکومت جماعت اسلامی ہی بنائے گی۔ لیکن دوسری طرف بعض نہایت ہی باوثوق ذرائع اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر قومی حکومت کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو مارشل لاء کی نگرانی میں ایک غیر سیاسی جماعت وجود میں آئیگی۔ جس میں مولانا کوثر نیازی گروپ اور مسلم لیگ کے علاوہ کچھ آزاد سیاستدان شامل ہوں گے۔ سرحد سے پر اسرار قیوم خان سنسنی خیز بیان جاری کرنے والے ملک جہانگیر، نصر اللہ خٹک اور سرحد کا معروف موقعہ پرست خاندان اس میں شامل ہو گا اس سلسلے میں یہ حلقے اس بات کا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ ان تمام لوگوں کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا جائے گا۔ مولانا کوثر نیازی جو اب الگ پی پی کا گروپ رکھتے تھے اسے ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔ کیونکہ جنرل ضیاء پی پی کے نام سے الرجک ہیں اور وہ پی پی کا نام نہیں سننا چاہتے خواہ وہ طفیلی پیپلز پارٹی ہی کیوں نہ ہو۔ نیازی گروپ کو مسلم لیگ میں شامل کرنے کے بعد پیپلز پارٹی کو تخریب پسند قرار دیکر اس پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔ اور اس طرح عظیم تر حمایت کی حامل پارٹی کو ختم کرنے کی آخری کوشش کی جائیگی اور فوجی حکومت کو جنرل ضیاء الرحمان بنگلہ دیشی کی طرز پر دوام بخشا جائے گا۔

جنرل شیر علی سے جنرل مجیب الرحمٰن تک

مبصرؔ کے قلم سے

میجر جنرل مجیب الرحمان (شیخ مجیب الرحمان کے ہم نام) جواب تک مرکزی وزارت اطلاعات میں ایڈیشنل سیکرٹری کے عہدے پر متمکن تھے اب ترقی پا کر سیکرٹری کے عہدہ پر تعینات کر دیتے گئے ہیں آج کل ویسے جدھر دیکھئے بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر جو پہلے شہری سول سروس کے تربیت یافتہ حضرات کے لئے مخصوص ہوتے تھے اب ان پر باوردی میجر، بریگیڈیئر اور میجر جنرل فائز نظر آتے ہیں کیوں نہ ہو اقتدار فوج کے ہاتھ میں ہے بقول شخصے جب سیّاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔ جو چاہیں گے کریں گے اب تو وہ قانون بھی خود ہیں اور انتظامیہ کا ڈنڈا بھی خود اب کوشش یہ ہے کہ مارشل لاء کو مستقل کیسے کیا جائے، کچھ ظاہری شکل بدلی جائے۔ پہلے قومی حکومت بنانے کی کوشش کی سو ناکام ہو گئی، پھر معجونِ مرکّب حکومت کا نسخہ سوچا گیا سو وہ بھی کارگر قرار نہ پایا۔ اب نئی سوچ یہ ہے کہ ایک عدد نام نہاد غیر جماعتی شہری" حکومت قائم کی جائے سیاسی سرگرمیوں پر تو پہلے ہی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اب ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا جائے یا انہیں معطل کر دیا جائے۔ اور پھر "انفرادی" طور پر (یہ انفرادی طور پر بھی خوب ہے) اپنے پسندیدہ سیاست دانوں کے سروں پر وزارتوں کے تاج رکھ دیتے جائیں۔ کاروں پر جھنڈے لگ جائیں، کچھ بڑی کوٹھیاں وزیروں کے لئے مخصوص کر لی جائیں، تنخواہیں اور بھتے مقرر ہو جائیں اور کہا جائے کہ بس اب "شہری" حکومت قائم ہو گئی ہے، مارشل لاء بدستور نافذ رہے گا، مارشل لاء ضوابط بدستور نافذ رہیں گے، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب خود وزیر اعظم یا صدر بنیں گے۔ ان کے تحت صوبوں میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحبان گورنر یا صوبائی وزیر اعلیٰ بنیں گے اور کہا جائیگا لیجئے صاحب، ہمارے سیاسی امراض کا یہی اسلامی نسخہ ہے جو تیر بہدف ثابت ہوگا۔ ادھر ملک میں عوام اور سیاسی جماعتیں مطالبہ کر رہی ہیں کہ قبلہ انتخابات کرایئے اور بیرکوں میں واپس جایئے، ملک کے قانون اور جمہوری روایات کے مطابق آپ کو جس کام کی تنخواہ عوام کی جیبوں سے دی جاتی ہے اسے ادا کیجئے یعنی سرحدوں کی حفاظت کیجئے، ویسے مارشل لاء حکومتوں کے نتیجہ میں سرحدیں ویسے ہی مختصر ہو گئی ہیں، نصف ملک کی سرحدیں تو ۱۹۷۱ء میں آپ دوسروں کے حوالے کر چکے ہیں ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کر کے ۔ اب اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ میں یہ کس سے کہہ رہا ہوں جو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ کی منزل پر پہنچ چکے ہیں جنہیں عقل و دانش اور ہوش مندی سے ازلی بیر ہے۔ جو تاریخ کی اتنی معمولی حقیقت سے واقف نہیں کہ آج کے بعد کل بھی ہوتی ہے۔ رات کے بعد دن بھی آتا ہے سورج غروب ہونے کے بعد طلوع بھی ہوتا ہے، ملک میں آج جتنی بے یقینی، بے چینی، افراتفری، جتنی پریشانی جتنی لاقانونیت، جتنی مہنگائی، جتنی منافع خوری، جتنی چور بازاری اور جتنی رشوت ستانی آج ہے کبھی نہیں تھی۔ اتنی زیادہ کہ لوگ گزشتہ افراتفری اور لاقانونیت کو بھول چکے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ملک کی تاریخ میں یہی ہوتا رہا ہے۔

اس وقت حکومت کے تمام شعبوں کا یہی حال ہے۔ اب وزارت اطلاعات کو لیجئے۔ پی ایف یو جے اور ایپنک کے مطالبے آج نہیں بلکہ آج سے تقریباً دس ماہ قبل یعنی ۸ جولائی کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام ایک یادداشت بھیجی تھی جس میں مختصراً ملک کے صحافیوں اور اخباری کارکنوں کے تمام ہی۔ قابل ذکر مسائل کو ان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ ان میں پانچ نکاتی اقتصادی مطالبات تھے اور آزادئ صحافت سے متعلق پی ایف یو جے اور ایپنک کا معروف موقف بھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ سابقہ حکومتوں کی یہی خرابی تھی کہ وہ اخبارات اور صحافیوں کے خلاف کالے، غیر معقول اور ہنگامی قوانین کے تحت کارروائیاں کرتی تھیں اور اس طرح اظہار اور صحافت کی آزادی کو مجروح کرتی تھیں، تنقید اور اختلاف کی آواز دباتی تھیں۔ اس صورت حال کا ازالہ یہی ہے کہ یہ فیصلہ کہ کس اخبار یا صحافی نے صحافت کے مسلّمہ اصولوں سے روگردانی کی ہے یا نہیں، ایک عام عدالت میں ملک کے تمام شہری اور جمہوری قوانین کے تحت کیا جائے انتظامیہ اس کا فیصلہ من مانے طور پر نہ کرے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت اخباروں کے خلاف من مانی کارروائیوں میں سابق حکومت کو مات دے دینا چاہتی ہے۔ اور میں تو کہوں گا کہ اس نے پچھلی حکومتوں کو اپنے سے پیچھے چھوڑ دیا ہے،

کسی پچھلی حکومت میں یہ منظر دیکھنے میں نہ آیا تھا کہ پہلے تو من مانے طور پر اختلافی اخبارات کو بند کر دو اور اس پر اگر احتجاج کیا جائے تو صحافیوں کو تھوک کے بھاؤ گرفتار کرو، انہیں مارشل لاء ضوابط کے تحت قید بامشقت اور جرمانوں کی سزا دو اور پھر بھی احتجاج جاری رہے تو پھر ان کو کوڑوں کی سزا بھی دو ۔ دراصل یہی وہ کارنامے ہیں جن کا انعام میجر جنرل مجیب الرحمان کو سیکرٹری کے عہدہ پر ترقی دیکر نواز دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے ایک بڑا معرکہ (میدان جنگ کا نہیں) سر کیا تھا یعنی بقول ان کے ٹیلیویژن کے کارکنوں کی سرکوبی۔ وہاں بھی انہوں نے بڑے جوہر دکھاتے، پہلے ٹیلیویژن یونینوں کے تمام سرکردہ رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا پھر انہیں قید بامشقت اور کوڑوں کی سزائیں۔ پھر ان کی ٹریڈ یونینوں کو توڑ دیا اور اب وہاں ڈنڈا راج نافذ کر دیا ہے۔ شاید قارئین کو یہ معلوم نہیں کہ جناب جنرل مجیب الرحمان صاحب وزارت اطلاعات میں آنے سے پہلے فوج میں "نفسیاتی جنگ" کے شعبہ کے انچارج تھے۔ (معلوم نہیں کہ آجکل بھی ہیں کہ نہیں) اس میدان میں ان کی تربیت امریکہ میں

ہوئی ہے۔ ان کا فوج کے محکمہ انٹیلی جنس سے بھی تعلق رہا ہے، جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ چنانچہ ٹیلیویژن کے کارکنوں سے نمٹنے کے بعد یہ لنگر لنگوٹ کس کر صحافیوں پر پل پڑے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے نفسیاتی جنگ کا بھی ادھورا ہی مطالعہ کیا ہے، ورنہ وہ اس درجہ عقل سے عاری حرکات و سکنات اور فیصلوں کے مرتکب نہ ہوتے، انہوں نے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کے وزیر اطلاعات گوئیبلز کا صرف ایک ہی قول گرہ سے باندھ رکھا ہے کہ جھوٹ اس قدر بولو اور اتنی بار بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک طرف تو یہ بھونڈے اور معروف ظالمانہ ہتھکنڈے کہ ایپنک اور پی ایف یو جے کی پُرامن علامتی بھوک ہڑتال کو کچلنے کے لئے وہ گرفتاریوں، قید بامشقت، جرمانوں اور کوڑوں کی سزاؤں اور اخباری کارکنوں کی ملازمت سے برطرفیوں کا سہارا لیتے ہیں جن سے ملک کے اندر اور ملک کے باہر حکومت کی بدنامی ہوئی ہے اور دوسری طرف چار غداروں کو پکڑ کر اس نوع کا یک فریقی اور یکطرفہ سمجھوتہ کرنا کہ جسے کوئی معقول، شریف اور صاحب رائے آدمی سمجھوتہ قرار ہی نہیں دے سکتا۔ یہ سمجھوتہ کیا ہوا جو فریق ثانی ہے اس پر اس کے دستخط ہی نہیں۔ سمجھوتہ تو مساوات لاہور کے بارے میں ہے، لیکن اس پر نہ مساوات لاہور کی انتظامیہ کے دستخط ہیں، نہ مساوات ورکرز یونین کے اور نہ ہی ایپنک اور پی ایف یو جے کی منتخب مرکزی قیادت کے۔ لیکن جنرل مجیب الرحمان صاحب ریڈیو، ٹیلی ویژن سرکاری خبررساں ایجنسیوں اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعہ جھوٹ باربار نشر کروا رہے ہیں کہ یہ سمجھوتہ ہے۔ بڑا اچھا ہے۔ بڑا معقول ہے اور اس میں دنیا بھر کے فرضی بیانات اور جعلی باتیں روزانہ بڑی عقیدت سے براڈکاسٹ کرا رہے ہیں اور مطمئن ہیں کہ بس پالا مار لیا، پوری قوم کو ان پر اعتماد آ گیا۔ ایپنک اور پی ایف یو جے کو اور ان کی قیادت کو تباہ کر دیا۔ ہائے ہائے کیا سادہ لوحی ہے۔ اپنی آواز خود ہی سنتے ہو۔ پانچ پانچ اور دس دس منٹ تک ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں میں قوم کو جھوٹ اور اتہام تراشیاں سناتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کی عقل کام نہیں کرتی۔ ارے بھائی سرکاری ابلاغ کے اداروں کا یہ ناجائز استعمال اتنا اور اس انداز میں پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا۔ انہیں لوگوں نے بھٹو کے زمانے میں ذرائع ابلاغ عامہ کے غلط استعمال کے بارے میں ایک قرطاس ابیض ابھی حال میں تیار کیا تھا۔ پہلے اسے چھاپنے کا ارادہ تھا، پھر شاید کسی جنرل نے کہا کہ میاں تمہیں تو بھٹو سے زیادہ ان اداروں کو استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے اس قرطاس کو دبائے رکھو۔ کہیں لوگ مقابلہ نہ کرنا شروع کر دیں لیکن عام لوگ آجکل ایپنک اور پی ایف یو جے کے خلاف ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروپیگنڈے پر اسی طرح ہنستے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے کی حکومتوں کے زمانہ میں ہنستے تھے ایک تماشہ ہے جو ہو رہا ہے۔ اور جنرل مجیب صاحب سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی جنگ سر کر لی ہے۔ بچارے شترمرغ بن گئے ہیں جو ریت میں سر چھپا کر سمجھتا ہے کہ طوفان ختم ہو گیا ہے

کچھ یہی صورت ۱۹۷۰ء میں قانونی عبوری امداد کے حصول کے لئے صحافیوں اور اخباری کارکنوں کی ملک گیر ہڑتال کے بعد پیدا ہوئی تھی، اس وقت بھی مارشل لا نافذ تھا، خود کو نپولین سمجھنے والے جنرل شیر علی وزارت اطلاعات کے سربراہ تھے ہڑتال کا فیصلہ ملک میں صحافیوں نے خفیہ بیلٹ کے بعد کیا تھا۔ یہ ایک قانونی فیصلہ تھا، مطالبہ بھی قانونی، جائز اور منصفانہ تھا، مالکان اخبارات ہائیکورٹ سے مقدمہ ہار چکے تھے، پھر بھی وہ حکومت کے مقرر کردہ اجرت بورڈ کے عبوری امداد کے ایوارڈ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

چنانچہ شیر علی اب میدان میں نکلے، انہوں نے جماعت اسلامی سے مشورہ کیا جس کے وہ شاید فوج کے اندر خفیہ ممبر رہے ہوں گے چنانچہ انہوں نے پہلے تو چودہ نام نہاد ایڈیٹروں سے جو حکومت اور جماعت اسلامی کے لئے بچے زیادہ اور ایڈیٹر کم تھے ایک عدد بیان ۲ اپریل ۱۹۷۰ء کو شائع کرایا اس میں کہا گیا کہ پی ایف یو جے کی ہڑتال کمیونسٹ کر رہے ہیں یہ عبوری امداد کے لئے نہیں ہے اس کے سیاسی مقاصد ہیں لہٰذا حکومت کو چاہیئے وہ اس کے رہنماؤں کے خلاف مارشل لاء کے ضابطے کے تحت کارروائی کرے۔ ان صحافی دشمن ایڈیٹروں میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو آج بھی حکومت کے ساتھ مل کر پی ایف یو جے کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ یعنی مجیب الرحمان شامی، الطاف حسن قریشی، مجید نظامی (مجید نظامی صاحب نے اس مرتبہ بنفس نفیس کوئی بیان نہیں دیا اور نہ تاحال کوئی اداریہ لکھا ہے۔ البتہ پی ایف یو جے کی تحریک کے خلاف مضامین چھاپے ہیں ان کا جواب انہیں شائع کرنے کی جرأت نہیں اس لئے وہ مرکزی مجلس عمل کے بیانات شائع نہیں کرتے) معظم علی وغیرہ ہم۔ جب ہڑتال کامیاب ہو چکی تو پھر جنرل شیر علی نہ صرف نیشنل پریس ٹرسٹ بلکہ نجی اخبارات سے بھی چن چن کر پی ایف یو جے اور اس سے ملحقہ تنظیموں کے عہدیداروں اور سرگرم کارکنوں کو ملازمت سے برطرف کرایا اور دوسری طرف جماعت اسلامی کے ممبر یا ہمدرد کارکن صحافیوں پر مشتمل ایک عدد صحافیوں کا نام نہاد کونشن لاہور میں منعقد کرایا اور اس میں صحافیوں کے نمائندہ جماعت کے مقابلہ میں ایک پاکٹ یونین یعنی نیشنل یونین آف جرنلسٹس (این یو جے) قائم کرا دی اور اسی طرح ان کے حق میں اور پی ایف یو جے اور اس کی قیادت کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کرایا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ تمام اوچھے ہتھکنڈے ناکام ہوتے، پی ایف یو جے بتدریج اور زیادہ مضبوط ہوئی اور اس کی منتخب قیادت پر صحافیوں کا اعتماد اور مستحکم ہوا۔

اب یہی کچھ ایک بار پھر جنرل شیر علی کی جگہ جنرل مجیب الرحمان صاحب کر رہے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی جنگ جیت لی ہے وہ ریڈیو ٹی وی اور سرکاری اخبارات کے ذریعہ غداروں کو لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ بھائی صاحب لیڈر اس طرح نہیں بنا کرتے، پی ایف یو جے اور ایپنک کوئی سیاسی جماعتیں نہیں کہ جن میں لیڈر بزعم خود بن جاتے ہیں یہ دونوں جماعتیں ٹریڈ یونینیں ہیں، ان کا دستور ہے ان میں انتخابات ہوتے ہیں اور ان میں انہی افراد کو چُنا جاتا ہے جنہوں نے کارکنوں کے مفاد کے لئے اصولی جدوجہد کی ہو اور قربانیاں دی ہوں۔ جو لوگ پیپلز پارٹی کے دور میں ۱۹۷۴ء میں اٹھارہ برطرف کارکنوں کے لئے حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے اخبار کی انتظامیہ اور حکومت کے خلاف اڑتالیس روز تک گرفتاریاں پیش کر سکتے تھے وہ آج بھی بھوک ہڑتال کی جدوجہد کو اپنے اصولوں کی خاطر جاری رکھ سکتے ہیں اور جاری رکھیں گے۔ آپ اپنی نفسیاتی جنگ کی تمام مہارتوں کے باوصف کامیاب نہیں ہونگے کیونکہ آپ ظلم کر رہے ہیں اور ناانصافی پر ہیں اور صحافی اور اخباری کارکن آخرکار کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حق اور انصاف پر ہیں اخباری کارکن آپ سے مودبانہ یہی عرض کریں گے کہ آپ گوئیبلز بننے کی کوشش نہ کریں اور یہ یاد رکھیں کہ آج گوئیبلز اور ہٹلر کن ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں اور ان کا کیا حشر ہوا تھا۔

3 جون جب اخباری کارکنوں نے یوم احتجاج منایا

ریڈیو اور ٹی وی کو سرکاری جھوٹ کا ٹھیکہ مل گیا

نمائندہ خصوصی

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے بھارتی فوجیں ڈھاکہ کی جانب پیشقدمی کر رہی ہیں۔ پاکستانی فوجیں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ سقوط ڈھاکہ یقینی ہو چکا ہے لیکن پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلیویژن اپنی خبروں میں بتا رہے ہیں۔ پاک افواج نہایت دلیری سے آگے بڑھ رہی ہیں اور جنرل نیازی کی بڑھک "بھارتی ٹینک میری لاش سے گذر کر ڈھاکہ میں داخل ہونگے" بڑے اہتمام سے نشر کی جا رہی ہے۔ ریڈیو پاکستان ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کی تین بجے سہ پہر کی خبروں تک "پاکستانی فوجوں کو بہادری سے آگے بڑھا رہا ہے حالانکہ ڈھاکہ میں بھارتی فوجیں داخل ہو چکی ہیں۔ اور پاکستانی افواج ہتھیار ڈال چکی ہیں ملک اپنے حصہ سے محروم ہو چکا ہے قوم پر ایک قیامت گذر چکی ہے۔ لیکن ریڈیو پاکستان کے ارباب کے نزدیک یہ اہم خبر نہیں۔ اسی لئے پانچ بجے شام کے بلیٹن کی آخری خبر میں کہا جاتا ہے کہ "بھارتی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور مشرقی محاذ پر جنگ بند ہو چکی ہے ریڈیو پاکستان سے خبریں ختم ہوئیں۔"

یہ مارچ اور اپریل ۱۹۷۷ء ہے ملک بھر میں احتجاج ہو رہا ہے ہنگامے ہیں، ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ فائرنگ کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن "سب ٹھیک ہے سکون ہے اور شانتی ہے" کا راگ الاپ رہے ہیں۔

یہ ۳ جون ۱۹۷۸ء ہے ملک بھر کے اخباری کارکن ایپنک اور پی ایف یو جے کی اپیل پر یوم احتجاج منا رہے ہیں کراچی پریس کلب میں جلسہ ہو رہا ہے۔ لاہور، پنڈی، پشاور، کوئٹہ حیدرآباد اور دیگر شہروں میں جلسے ہو رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن کہہ رہے ہیں۔ کہ یوم احتجاج ناکام رہا کے یو جے جنگ، امن، سن، ڈان، مشرق کی یونینوں نے یوم احتجاج میں شرکت نہیں کی۔ اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن جو قومی ادارے ہیں اور عوام کے ٹیکسوں پر چلتے ہیں۔ لیکن حکومت کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکمرانوں کا مفاد ہی قومی اور عوامی مفاد ہوتا ہے یہ ریڈیو پاکستان ہی تھا جس کے ارباب اقتدار نے بابائے قوم قائد اعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر میں سے وہ جملے نکال دیئے۔ جن میں لیاقت حکومت پر تنقید کی گئی تھی جب ذرائع ابلاغ کے ارباب اقتدار بابائے قوم کی بہن کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں تو اخباری کارکن کس شمار قطار میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ بی بی سی سنتے ہیں اور ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن پر اعتبار نہیں کرتے۔

بہرحال اب آپ "یوم احتجاج" کی رپورٹ پڑھیئے جو ملک بھر میں ایپنک اور پی ایف یو جے کی اپیل پر منایا گیا۔

۳ جون کو ایپنک اور پی ایف یو جے کی مرکزی مجلس عمل کی ہدایت پر ملک بھر کے اخباری کارکنوں نے اخبارات اور اخباری کارکنوں کے خلاف حکومت کی زیادتیوں کے خلاف یوم احتجاج منایا۔ اس سلسلے میں آج ملک بھر کے اخباری مراکز میں ایپنک اور پی ایف یو جے کی مقامی کمیٹیوں کے زیر اہتمام بڑے بڑے اجتماعات منعقد کیئے گئے جن میں کراچی لاہور راولپنڈی، حیدرآباد، پشاور، کوئٹہ، ملتان اور دیگر مراکز شامل ہیں۔ اخباری کارکنوں کے ان جلسوں میں مساوات لاہور کے بارے میں حکومت اور نام نہاد پی یو جے مذاکراتی ٹیم کے سمجھوتے اور ان چار رکنی ٹیم کی جس نے پی ایف یو جے اور ایپنک کے فیصلوں کے خلاف حکومت سے مذاکرات کیئے۔ شدید مذمت کی گئی۔ تمام مراکز میں اخباری کارکنوں نے ایک بار پھر اپنے آٹھ نکاتی مطالبات کی تکمیل تک جدوجہد جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا۔ کراچی میں اخباری کارکنوں کا ایک بہت بڑا اجتماع آج سہ پہر کراچی پریس کلب میں منعقد ہوا جس کا اہتمام ایپنک کراچی کمیٹی نے کیا تھا۔ اور صدارت ایپنک اور پی ایف یو جے کے صدر جناب منہاج برنا نے کی۔ مقررین میں دوسروں کے علاوہ کراچی ایپنک کے صدر اور جنگ ایمپلائز یونین کے سیکریٹری جناب محمود علی اسد، کے یو جے کے سیکریٹری جناب احفاظ الرحمان، ہیرالڈ ورکرز یونین کے سیکریٹری جناب موسیٰ جی دیپک، حریت ایمپلائز یونین کے نائب صدر جناب ریاض احمد خان، مساوات ایمپلائز یونین کے صدر جناب شبیر اعظمی، سن ورکرز یونین یونین کے سیکریٹری جناب احمد بیگ، امن ایمپلائز یونین کے سیکریٹری جناب طاہر نجمی ہلال پاکستان ورکرز یونین کے صدر جناب موسیٰ طاہر، صداقت ایمپلائز یونین کے سیکریٹری جناب راشد علی خان اور کے یو جے معیار یونٹ کے چیف جناب مجاہد بریلوی نے خطاب کیا دوسرے جن حضرات نے اخباری کارکنوں کی حمایت میں تقاریر کیں ان میں کراچی یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر جناب مصطفین کاظمی، بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے صدر جناب رازق بگٹی، پاکستان خواتین محاذ کی آرگنائزر مسز لالہ رخ، اور کراچی مزدور رابطہ کمیٹی کے نمائندے جناب شفیع کلہوڑا، شامل ہیں۔ مشہور شاعرہ فہمیدہ ریاض اور شاعر اعجاز راہی نے اس موقعہ پر اخباری کارکنوں کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ جلسہ گاہ نعروں سے گونجتا رہا۔

جلسہ میں مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کی متعدد تنظیموں کی طرف سے متعدد رہناؤں کے خیرسگالی اور یکجہتی کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ان میں کراچی یونیورسٹی کے پروگریسو فرنٹ کی جانب سے جناب رفیق پٹیل کراچی این ایس ایف کی طرف سے جناب اسحٰق سولنگی، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے جناب عاقل لودھی، سندھ این ایس ایف کی طرف سے سٹر جبار خٹک: سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے جناب ہمادر ب ، ورکرز آرگنائزیشن کمیٹی کی طرف سے جناب محمد جعفر، کراچی نوجوان محاذ کی طرف سے جناب کلیم دراتی، لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کی طرف سے جناب اکرم دھریجہ

سندھ عوامی تحریک کی جانب سے جناب رؤف نظامانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے جناب رفیق چودھری اور کراچی مزدور کسان پارٹی کی جانب سے جناب وحید مسیح شامل ہیں۔ جلسہ میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اخباری کارکنوں نے اپنے تمام مطالبات کی تکمیل تک جدوجہد جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا جن میں مندرجہ ذیل مطالبات شامل ہیں۔ مساوات کراچی میں ۱۰ مئی سے قبل کی صورتحال کی بحالی، ہفت روزہ الفتح اور معیار کی بحالی، پریس آرڈیننس سمیت تمام سیاہ قوانین کی منسوخی، تمام گرفتار شدہ اور سزا یافتہ اخباری کارکنوں اور ان کی حمایت میں گرفتار ہونے والے اور سزا پانے والے مزدوروں اور طلباء کی غیر مشروط طور پر فوری رہائی، برطرف کارکنوں کی ملازمت پر بحالی اور اینپک پی ایف یو جے پانچ نکاتی اقتصادی مطالبات کی تکمیل جلسہ نے ۶، اور ۷، جون کو کراچی میں ہونے والے اینپک اور پی ایف یو جے کی مرکزی مجالس عاملہ کے اجلاسوں سے سفارش کی کہ چار رکنی ٹیم کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے تاکہ آئندہ کسی کو اخباری کارکنوں کے مفاد سے غداری کرنے کی جرأت نہ ہو۔ جلسہ میں اپنے ان ساتھیوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا جو آزادئ صحافت کی جدوجہد کی پاداش میں سزا بھگت رہے ہیں۔ اخباری کارکنوں نے عہد کیا کہ وہ سارے ملک میں اس سمجھوتہ کو اور زیادہ بے نقاب کرینگے۔ اور اپنے آٹھ نکاتی مطالبات کی مکمل منظوری تک اپنی تاریخی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اجلاس میں تمام ملازمین نے حکومت کی جانب سے ریڈیو، ٹیلیویژن، خبر رساں ایجنسیوں اور ابلاغِ عامہ کے دوسرے اداروں کے ناجائز استعمال کی شدید مذمت کی اور کہا کہ ان کے ذریعہ جو گمراہ کن اور شرانگیز پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اس سے عوام دھوکہ نہیں کھائیں گے۔

بقیہ : پی آئی اے

کا باعث بن جاتے؛ پی آئی اے جو مرغیاں پالنے، ہوٹل چلانے اور دوسرے ایسے ہی ہزاروں اخراجات کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتی، کروڑوں روپے کا سکواش کمپلیکس تعمیر کرنے کے ساتھ لاکھوں روپیہ سالانہ اس کھیل پر خرچ کرتی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق گذشتہ ہاکی میچ پر تقریباً ۱ ملین ڈالر (ایک کروڑ روپیہ) خرچ کر چکی ہے اور اب آئندہ نومبر میں چھ مہمان ٹیموں کے اخراجات بھی برداشت کرے گی جو کسی طرح بھی چھ کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہوں گے تو پھر چند لاکھ روپے دے کر اس مسئلہ کو حل نہ کرنے دینا کسی بہت بڑے المیہ کی طرف لے جانے کی کوشش تو نہیں کی جا رہی۔ کیا ہمارے سامنے ایئر سیلون کا انجام نہیں۔

پی آئی اے انجینئرنگ کے رویے کے خلاف اب تک تقریباً ۵ صد کے قریب ملازمین ملازمتیں چھوڑ کر بیرونِ ملک جا چکے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ۳۰ ملازمین کی ایک پوری شفٹ جس میں انجینئرز اور عملہ شامل تھا، صبح ڈیوٹی پر آیا، اور پھر اُردن کے ایک اعلیٰ افسر کی موجودگی میں عالیہ ایئرویز کے جہاز میں سوار ہو کر ملک سے فرار ہو گئے۔

اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا زیادہ مشکل نہیں کہ ایک مخصوص ذہن اس قومی فضائی کمپنی کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور ایئر سیلون کے انجام کی طرف رفتہ رفتہ اسے لے جایا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ صرف انجینئروں کی بات نہیں۔ ملازمین کے تمام طبقوں میں شدید بے چینی پیدا ہو چکی ہے، کہ تنخواہوں کے اعتبار سے یہ ادارہ کبھی ملک میں سرِفہرست ہوا کرتا تھا۔ اب بارھویں تیرھویں نمبر پر ہے۔ اور اسی کے باعث ہر شعبہ سے ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد ملازمتیں چھوڑ کر باہر جانے کے لئے تیار ہے۔ جہاں انہیں پی آئی اے سے زیادہ سہولتیں مل رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس مجرمانہ غفلت کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کون پی آئی اے کو مسلسل تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ آج پاکستان کا ہر شہری یہی سوچ رہا ہے۔

میرپور خاص

خادم علی شاہ کی وضاحت

محبوب احمد

پاکستان کے صحافیوں کی تاریخی جدوجہد میں شمولیت گرفتاری اور رہائی کے بعد کراچی پہنچا تو سرِ راہے جناب خادم علی شاہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ پچھلے ہفتے تھرپارکر کی سیاسی شخصیتوں کے ذکر اور اس ضمن میں ان کے اپنے تذکرے سے کافی ملول تھے۔ کہنے لگے کہ "آپ نے واقعات و حالات کم از کم میرے بارے میں بغیر تحقیق کے لکھے ہیں"۔ میں نے کہا کہ ہمارا مقصد اپنے قارئین کو معروضی صورتِ حال سے واقف کرانا ہے۔ آپ اپنے بارے میں جو کچھ وضاحت کرنی چاہتے ہیں وہ بھی قارئین تک پہنچ جائے گی۔

جناب خادم علی شاہ نے بتلایا کہ وہ پیپلز پارٹی میں عوام کی خدمت کے نصب العین کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ پارٹی کا پروگرام کل بھی عوام کا پروگرام تھا آج بھی ہے اور وہ اس پروگرام سے وفاداری پر قائم ہیں۔ بھٹو اور اُن کے خاندان سے محبت بھی اسی حوالے سے ہے۔

چونکہ ان کا تعلق نوجوانوں کے اس حلقے سے ہے جو اقتدار سے باہر رہ کر عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس لئے کبھی بھی حصولِ اقتدار کی سازشوں میں شریک نہیں ہوئے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات تھرپارکر سے قومی اسمبلی کے لئے ٹکٹ مرکزی قیادت نے دیا تھا۔ انتخاب جیت بھی گئے لیکن وہ اسمبلی ہی توڑ دی گئی۔

مسٹر ریٹیانی سے تعلق کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ وہ میرے یا میں اُن کا اُستاد ہوں۔ وہ پی پی پی میں تھے تو دوست تھے۔ پارٹی سے گئے تو دوستی بھی گئی۔ اب وہ انہیں صرف "ملاقاتی" ہی کہہ سکتے ہیں۔

انہوں نے مارشل لاء کے بعد خاموشی کو الزام قرار دیا ثبوت میں ان بیانات کا حوالہ دیا جو عوامی مسائل کے سلسلے میں وہ دیتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھی کارکن ان کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ خدارا ان چہروں سے نقابیں نوچیئے جو بظاہر بھٹو کے ساتھ اور بباطن کوثر نیازی کے حلقہ بگوش ہیں۔

بقیہ: سرورق

برداشت ہیں" معراج کا یہی بیان "قابل تعزیر" جرم بن گیا۔ اور ۷ مئی کو فوجی عدالت نے انہیں ایک سال قید سخت کی سزا دے دی۔ جناب معراج کو اٹک جیل میں "سی" کلاس میں رکھا گیا۔ اور قیدیوں والے کپڑے پہنا دیئے۔ جیل معراج کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ایوب خان سے لے کر اب تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں۔ انہوں نے معراج کو پابند سلاسل کیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں صرف چہرے بدلتے ہیں نظام نہیں بدلتا اور نہ انداز شہر یاری۔

جناب معراج نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ جب تک گرفتار شدہ تمام اخباری کارکنوں کو رہا نہیں کیا جاتا، عوام کے شہری اور بنیادی حقوق بحال نہیں کئے جاتے اور الیکشن کی قطعی تاریخ کا اعلان نہیں کیا جاتا، وہ بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے۔ بھوک ہڑتال کے دوران معراج کو قید تنہائی میں رکھا گیا۔ انہیں متعدد بار خون کی قے ہوتی۔ آنکھ اور سر میں مستقلاً درد رہنے لگا لیکن جیل میں انہیں علاج کی کوئی سہولت مہیا نہیں کی گئی۔ البتہ جیل حکام کی کوشش رہی کہ کسی طرح بھوک ہڑتال ختم کرا دیں۔ جب معراج کی صحت بہت گر گئی۔ تو جیل انتظامیہ نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ وہ معراج کو گلوکوز لگاتے جس میں بے ہوشی کی دوا بھی شامل ہوتی۔ اور جب وہ بے ہوش ہو جاتے تو مصنوعی مشینی طریقے سے دودھ اُن کے معدے میں ڈالا جاتا۔ ایک طرف یہ صورتحال تھی اور دوسری طرف جماعت اسلامی کے ڈھنڈورچی زندگی اور جسارت یہ خبریں لگا رہے ہیں کہ معراج محمد خان بھوک ہڑتال پر نہیں تھے اور کھانا کھاتے تھے اور چائے پیتے تھے، اب ان اخبارات کا کام یہی رہ گیا ہے۔ عوام خود پہچانیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ بہر حال اب معراج نے اخباری کارکنوں کی اپیل پر بھوک ہڑتال ختم کر دی ہے لیکن ان کی صحت تشویشناک حد تک گر گئی ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ معراج کراچی میں ڈاکٹر جمعہ اور ڈاکٹر کرمانی کے زیر علاج تھے لیکن اب جیل میں انہیں علاج کی تمام سہولتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں اگر معراج کو کچھ ہو گیا تو اس کی تمام ذمے داری مارشل لا انتظامیہ پر ہو گی۔

جیل حکام کے علاوہ بھی تنگ کرنیوالے کے خلاف بھٹو کی بھوک ہڑتال!

ذوالفقار حیدری

سابق وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جو ان دنوں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں مقید ہیں، دوبارہ احتجاجاً بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ اور تادم تحریر (یہ سطور ۴ جون کی شام کو لکھی جا رہی ہیں) بھوک ہڑتال جاری ہے اس امر کا انکشاف مسٹر بھٹو کے بڑے وکیل یحییٰ بختیار نے کیا۔ انہوں نے ۴ جون کو مسٹر ڈی۔ ایم۔ اعوان کے ہمراہ جیل میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی تھی۔ جو ایک گھنٹے تک جاری رہی

جناب یحییٰ بختیار نے بتایا کہ مسٹر بھٹو گذشتہ جمعے (۲ جون ۱۹۷۸ء) سے احتجاجاً بھوک ہڑتال پر ہیں۔ اُن کی صحت بہت گر گئی ہے اور وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں مسٹر یحییٰ بختیار کے مطابق جناب بھٹو نے بھوک ہڑتال کا سبب یہ بتایا کہ جیل کے حکام کا رویہ بہت خراب ہے مزید یہ کہ جیل کے انتظامی معاملات خصوصاً وہ معاملات جو مسٹر بھٹو سے متعلق ہوتے ہیں، اُن میں فوجی مداخلت کرتے ہیں مسٹر بھٹو نے مبینہ طور پر الزام لگایا کہ ایک کرنل بار بار انہیں تنگ کرتا ہے۔ اور اُن کا کھانا اس بُرے طریقے سے چیک کرتا ہے کہ پھر کھانے کو دل نہیں چاہتا مسٹر

بھٹو نے بتایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی جیل کی انتظامیہ میں شامل ہیں؟ جواب ملا کہ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے!"

جیل حکام کے اس ناروا اور توہین آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جناب بھٹو نے ایک ہفتے قبل جیل قدمی کرنی بند کر دی تھی۔ لیکن جیل حکام نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ جس پر مسٹر بھٹو نے گذشتہ جمعے سے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اور کہا کہ جب تک جیل کے حکام اپنا رویہ درست نہیں کرتے، اُن کی صحت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور جیل کے انتظامی امور میں غیر متعلقہ افسروں کی مداخلت بند نہیں کی جاتی، تب تک وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔

مسٹر بھٹو کے سیل کی چابیاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اپنی تحویل میں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں نہ تو سیل کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے اور نہ بند کیا جا سکتا ہے۔ خواہ دروازہ کھولنے کی کتنی اشد ضرورت ہو۔ ۳ جون ۱۹۷۸ء کو مسٹر بھٹو کے پیٹ میں درد تھا اور دست آ رہے تھے۔ تین بجے کے قریب انہوں نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ لیکن اُس وقت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل موجود نہیں تھے۔ تالوں کی چابیاں ان کے پاس تھیں۔ چنانچہ سیل کے دروازے نہ کھولے جا سکے اور ڈاکٹر نہ تو جناب بھٹو کا معائنہ کر سکا اور نہ کوئی دوا دے سکا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل شام سات بجے آئے۔ جناب بھٹو نے انہیں بلوایا اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے ڈاکٹر کو بلوائیے۔ جس پر جواب ملا۔ کہ "ڈاکٹر اپنے گھر چلا گیا ہے۔ اب وہ صبح ہی آپ کا طبی معائنہ کرے گا اور دوا دے گا۔" یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایک ایسے افسر جس کا جیل انتظامیہ سے دور کا بھی تعلق نہیں، کے حکم پر مسٹر بھٹو کے سیل کی چار کوٹھریوں اور مین گیٹ پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں۔ تاکہ جناب بھٹو کو ذہنی اذیت پہنچائی جا سکے۔

۳ جون جب اخباری
کارکنوں نے یوم احتجاج منایا

امن ایمپلائز یونینز کے جنرل سیکرٹری طاہر نجمی جلسے سے خطاب کر رہے ہیں

کراچی یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سیکرٹری احفاظ الرحمٰن جلسے سے خطاب کر رہے ہیں، اپینک اور پی ایف یو جے کے صدر منہاج برنا، اپینک کراچی کے صدر محمود علی اسد (جنگ)، اپینک کراچی کے جنرل سیکرٹری امیر احمد خان (ڈسن) اور ہیرالڈ ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری موسیٰ جی دیپک شہہ نشین پر نظر آ رہے ہیں۔